انقلابِ بہار
مصر اور ترکی کا بدلتا سیاسی تناظر
محمد یونس عالم

انقلابِ بہار

مصر اور ترکی کا بدلتا سیاسی تناظر

مصنف

محمد یونس عالم

Narratives

انقلابِ بہار

مصر اور ترکی کا بدلتا سیاسی تناظر

مصنف
محمد یونس عالم

Narratives

نام کتاب	:	انقلاب بہار، مصر اور ترکی کا بدلتا سیاسی تناظر
تالیف	:	محمد یونس عالم
سرورق	:	طارق ایم سجاد
اشاعت	:	فروری ۲۰۱۴ء
تزئین	:	زی گرافکس
تعداد	:	ایک ہزار
صفحات	:	۱۱۹
قیمت	:	۲۵۰ روپے
مطبع	:	بی پی ایچ پرنٹرز، لاہور

ISBN: 978-969-9645-34-1

پوسٹ بکس نمبر 2110، اسلام آباد

فون: 051-2806074

ای میل: info@narratives.pk

ویب سائٹ: narratives.pk

انتساب

میرے مرحوم والد کے نام، جن کے علمی معیار اور ادبی ذوق کی
ایک بوند نے میرے بنجر لفظوں کو سیراب کر دیا

اور

اس عظیم ماں کے نام، جو رب کے حضور ہاتھ اٹھائے تو جہالت
کے پردوں میں پڑے زنگ آلود قلم بھی لفظ اگلنے لگے۔

فہرست

مقدمہ

پورا عالم اسلام اضطراب کی ایک تصویر بنا ہوا ہے۔ اس اضطراب کے پیچھے کہیں مسلط کیے گئے آمروں کا جبر اور کہیں خود مسلمانوں کا جمود کارفرما ہے۔ جن کی حیثیت فیصلہ کن ہے وہ دو انتہاؤں پر کھڑے ہیں۔ ایک انتہا پر لبرل فاشسٹ ہیں اور دوسری انتہا پر مذہبی انتہا پسند۔ ان دو انتہاؤں کے بیچ بسنے والے انسانوں کا دم گھٹ رہا ہے۔ وہ بیچ ہی کا کوئی راستہ دریافت کرنا چاہتے ہیں مگر گھوم پھر وقت کی تیز ہوائیں انہیں کسی ایک انتہا پر ہی پہنچا دیتی ہیں۔ اس انتہا پر جائیں تو جمہوریت کی غلط تشریح کو درست الفاظ میں رکھ کر پیش کر دی جاتی ہے اور اس انتہا پر آئیں تو دین کی غلط تعبیر بھی قرآن کے بیچوں بیچ سے نکال کر ٹھیک انداز میں سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ کہیں افسانوں کی طرح انسانی حقوق کے دعوے اور کہیں جنس ارزاں کی طرح دین خدا کی باتیں۔ اگر دیکھنے پر آئیں تو انسانی حقوق ملیں گے اور نہ ہی خدا کا دین۔ کسی اور دنیا کی ہم کیا بات کریں خود ہمارا ملک پاکستان اس قسم کے تضادات کا ایک حسین مجموعہ ہے۔ ایک مکتبہ فکر کا زعم ہے کہ ہم قائداعظم کا پاکستان بنانے جا رہے ہیں تو دوسرے کا دعویٰ ہے کہ ہم اس ملک کو سالارِ اعظم کا ملک بنا کر دم لیں گے۔ اب اگر دونوں دعووں کو سامنے رکھ کر جائزہ لیں تو نتیجے میں مایوسی ہی ملے گی۔ سچ یہ ہے کہ اس ملک میں کوئی کام اگر خلوص نیت کے ساتھ ہوا ہے تو وہ یہی ہے کہ قائداعظم اور سالارِ اعظم کے اصولوں کو جس قدر ممکن ہو سکے پامال کیا جائے۔ پاکستان کے اصول انہی کے ہاتھوں پامال ہوئے جن کے سینوں پر سبز ہلالی پرچم کے بیج لگے ہیں اور دین انہی کے ہاتھوں رسوا ہوگیا جن کے سروں پر عمامے سجے ہیں۔ یہی دو انتہائیں ہیں جس کے بیچ ایک عام شہری آنکھوں میں ایک سوال لیے کھڑا ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں درست سمت کا تعین کس طرح کروں؟ خود مجھے اسے سوال کی تلاش ہے۔ تلاش کا یہ سفر ابھی جاری ہے۔ زیر نظر کتاب اسی گردسفر کا ایک نتیجہ ہے۔

سال 2011 میں عرب دنیا نے ایک انگڑائی لی اور برسوں سے مسلط آمروں کا حساب بے باق کرنے کی ہوا چل پڑی۔ اس ہوا میں تیونس، مصر اور لیبیا میں تاج و تخت اڑا دیے گئے۔ یہ ہوا شام بھی پہنچی مگر وہاں کی اسٹیبلشمنٹ نے اس ہوا کا رخ شیعہ سنی فسادات کی طرف موڑ دیا۔ اس پوری صورت حال نے خطے کے سیاسی ماحول میں کافی تبدیلی پیدا کر دی۔ کہیں ضرورت سے زیادہ انقلابی لہر سے توقعات وابستہ کی گئیں اور کہیں اسی انقلابی لہر کے پیچھے عالمی طاقتوں کا ہاتھ بتایا گیا۔ آمریت کا خاتمہ ہوا اور منتخب جمہوری حکومتیں قائم ہوئیں۔ تیونس اور مصر کی جمہوریت ابھی گھٹنوں کے بل ہی چل رہی تھی ایک نیا سیاسی بحران کھڑا ہو گیا۔ اس پوری گہما گہمی میں یورپ کے اس مرد بیمار کی طرف کم ہی کسی کی نگاہ گئی جو بہت تیزی کے ساتھ تندرست و توانا ہو رہا تھا۔ یورپ کے مرد بیمار ترکی کے دکھوں کی دوا بھی جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی نے کی جسے بجا طور پر مصر کی اخوان المسلمون اور تیونس کی النہضہ پارٹی کی ہم خیال جماعت کہا جا سکتا ہے۔ شاید ان کی طرف نگاہیں اسی لیے نہیں اٹھیں کہ ترکی نے اچھل کر بستر پر بیٹھنے کے بجائے کچھوے کی چال چلنے کا فیصلہ کیا۔ یہ ایک ایسی چال تھی جس میں مذہب اور ریاست کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو پھر سے استوار کرنے کے لیے اہداف کا تعین کیا گیا۔ ان اہداف کے لیے جو راستہ اختیار کیا گیا وہ معاشی اقتصادی اور سیاسی استحکام سے ہو کر گزرتا تھا۔ اسی لیے دنیا کو جب تک خبر ہوئی ترکی دنیا کی دس بڑی معیشتوں میں کھڑا ہو کر اسلامی دنیا میں قائدانہ کردار ادا کر رہا تھا۔ دوسری طرف اگر مصر میں برسر اقتدار آنے والی اخون المسلمون کا جائزہ لیں تو ایک مکمل مختلف صورت حال سامنے آتی ہے۔ اگرچہ اخوان المسلمون نے مفاہمت کی ہر ممکن کوشش کی مگر بدترین معاشی بحران میں برسر اقتدار آنے والی یہ جماعت یہ تاثر قائم نہیں کر سکی کہ معیشت اور خوش حالی ہماری اولین ترجیح میں شامل ہیں۔ اس میں کوئی دوسری رائے نہیں کہ مصر میں اخوان المسلمون کی منتخب حکومت پر جس طرح شب خون مارا گیا وہ دنیا کی بڑی جمہوری طاقتوں کے لیے ایک ناقابل حل سوال ہے، مگر اس حقیقت کو بھی تسلیم کیا جانا چاہیے کہ حالات کا تقاضہ اب یہ ہے کہ اپنی پالیسیوں اور طرز عمل کا پھر سے جائزہ لیا جائے۔ ارتقا کو ایک حقیقت تسلیم کرتے ہوئے دستیاب ماحول میں اپنی جگہ تلاش کی جائے۔ اس تصور کو درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ عالمی سازشوں کے ہوتے ہمارے لیے

راستہ نکالنا ممکن نہیں ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے۔ جس کی جیتی جاگتی مثال ترکی ہمارے سامنے ہے۔ ترکی کی موجودہ حکمراں جماعت کی "سینٹرل رائٹ پالیسی" ہی میری نظر میں وہ نسخۂ اکسیر ہے جو نہ صرف یہ کہ مذہبی شناخت کے ساتھ ابھرتی ہوئی جمہوری قوتوں کے لیے کارگر ثابت ہو سکتی ہے بلکہ خطے کی ہر اس سیاسی طاقت کے لیے سودمند ہے جو معاشی اور اقتصادی ترقی کا خواب تو دیکھتی ہیں مگر تعبیر نہیں ملتی۔

جو سوال میں نے ابتدا میں اٹھایا اس کا جواب ترکی اور مصر کی حالیہ صورت حال میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ترکی کی گزشتہ گیارہ برسوں کی تاریخ مذہب پسند سیاسی جماعتوں کی راہنمائی کرتی ہے کہ ریاست کی مذہبی اصلاح تب ہی ممکن ہے جب حکمران سماج کی ضروریات کا ادراک کرلیں۔ اگر ایک سیاسی جماعت ریاست کے شہری کا معیار زندگی بلند نہیں کر سکتی تو وہ نظریاتی اصلاحات کا جواز بھی کھو دیتی ہے۔ دوسری طرف مصر کی حالیہ مختصر تاریخ جہاں مذہب پسند سیاسی قوتوں کو اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینے کا درس دیتی ہے، وہاں عالمی جمہوری قوتوں کے دوہرے معیار کا پردہ بھی چاک کرتی ہے۔ عالمی قوتوں کی ایما پر مصر کی تاریخ کی پہلی منتخب حکومت کا دھڑن تختہ کر کے ان لوگوں کو اقتدار کی پالکی میں بٹھایا گیا جنہیں عوام نے انتخابات میں مسترد کر دیا تھا۔ مغربی قوتوں اور عالمی ذرائع ابلاغ نے انتخابات میں عوام کے دیے گئے فیصلے کو مسترد کر دیا اور تحریر سکوائر میں جمع ہونے والے مرسی مخالف مظاہرین کو عوام کی آواز قرار دے دیا گیا جو چند ہزار تھے۔ اگر اسی معیار کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رابعہ العدویہ میں جمع ہونے والے لاکھوں سیسی مخالف مظاہرین کی آواز کس مخلوق کی تھی۔ کیا وہ عوام نہیں تھے جنہیں سنائپر شوٹرز نے تاک تاک کر نشانہ بنایا؟ احتجاجی خیمے بلڈوز کر کے انسانوں کو زندہ جلایا گیا اور دنیا کا ہر وہ ادارہ خاموش رہا جس کا ایمان جمہوریت پر ہے۔

ترکی اور مصر میں رونما ہونے والے سیاسی بحرانوں پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر میں نے محسوس کیا کہ ترکی کی موجودہ حکمراں جماعت اور مصر کی اخوان المسلمون کے پس منظر سے ناواقفیت کی بنا پر حقائق تک پہنچنے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ اسی لیے دونوں ممالک میں پیدا ہونے والے سیاسی بحرانوں پر فوری ردعمل دینے کے بجائے جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی اور اخوان المسلمون کی

راستہ نکالنا ممکن نہیں ہے۔نہیں، ہرگز نہیں۔ یہ بالکل ممکن ہے۔جس کی جیتی جاگتی مثال ترکی ہمارے سامنے ہے۔ ترکی کی موجودہ حکمراں جماعت کی ''سینٹرل رائٹ پالیسی'' ہی میری نظر میں وہ نسخۂ اکسیر ہے جو نہ صرف یہ کہ مذہبی شناخت کے ساتھ ابھرتی ہوئی جمہوری قوتوں کے لیے کارگر ثابت ہو سکتی ہے بلکہ خطے کی ہر اس سیاسی طاقت کے لیے سودمند ہے جو معاشی اور اقتصادی ترقی کا خواب تو دیکھتی ہیں مگر تعبیر نہیں ملتی۔

جو سوال میں نے ابتدا میں اٹھایا اس کا جواب ترکی اور مصر کی حالیہ صورت حال میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ترکی کی گزشتہ گیارہ برسوں کی تاریخ مذہب پسند سیاسی جماعتوں کی راہنمائی کرتی ہے کہ، ریاست کی مذہبی اصلاح تب ہی ممکن ہے جب حکمران سماج کی ضروریات کا ادراک کرلیں۔ اگر ایک سیاسی جماعت ریاست کے شہری کا معیار زندگی بلند نہیں کر سکتی تو وہ نظریاتی اصلاحات کا جواز بھی کھو دیتی ہے۔ دوسری طرف مصر ہی کی حالیہ مختصر تاریخ جہاں مذہب پسند سیاسی قوتوں کو اپنی ترجیحات کا از سر نو جائزہ لینے کا درس دیتی ہے، وہاں عالمی جمہوری قوتوں کے دوہرے معیار کا پردہ بھی چاک کرتی ہے۔ عالمی قوتوں کی ایما پر مصر کی تاریخ کی پہلی منتخب حکومت کا دھڑن تختہ کر کے ان لوگوں کو اقتدار کی پالکی میں بٹھایا گیا جنھیں عوام نے انتخابات میں مسترد کر دیا تھا۔ مغربی قوتوں اور عالمی ذرائع ابلاغ نے انتخابات میں عوام کے دیے گئے فیصلے کو مسترد کر دیا اور تحریر سکوائر میں جمع ہونے والے مرسی مخالف مظاہرین کو عوام کی آواز قرار دے دیا گیا جو چند ہزار تھے۔ اگر اسی معیار کو درست مان لیا جائے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ رابعہ العدویہ میں جمع ہونے والے لاکھوں سیسی مخالف مظاہرین کی آواز کس مخلوق کی تھی۔ کیا وہ عوام نہیں تھے جنھیں سنائپر شوٹرز نے تاک تاک کر نشانہ بنایا؟؟ احتجاجی خیمے بلڈوز کر کے انسانوں کو زندہ جلایا گیا اور دنیا کا ہر وہ ادارہ خاموش رہا جس کا ایمان جمہوریت پر ہے۔

ترکی اور مصر میں رونما ہونے والے سیاسی بحرانوں پر بہت کچھ لکھا گیا، مگر میں نے محسوس کیا کہ ترکی کی موجودہ حکمراں جماعت اور مصر کی اخوان المسلمون کے پس منظر سے ناواقفیت کی بنا پر حقائق تک پہنچنے میں مشکل پیش آ رہی ہے۔ اسی لیے دونوں ممالک میں پیدا ہونے والے سیاسی بحرانوں پر فوری ردعمل دینے کے بجائے جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی اور اخوان المسلمون کی

حالیہ تاریخ کا اس کے پس منظر کے ساتھ جائزہ لیا گیا۔ ترکی کا آغاز مصطفیٰ کمال سے کیا اور موجودہ وزیراعظم طیب رجب اردگان پر اس کا اختتام کیا۔ اسی طرح مصر کی تاریخ کا آغاز جمال عبدالناصر اور امام حسن البنا سے کیا اور صدر محمد مرسی پر اس کا اختتام کیا۔ اس میں تاریخ کو ہی پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ تاریخ کو ان تلخ تجربات کے تابع رکھا ہے جس کا سامنا "حقیقی جمہوریت پسند" طاقتوں نے کیا ہے۔

روزنامہ امت میں شائع ہونے والے کالموں کی اس سیریز کو میرے گمان سے بڑھ کر سراہا گیا۔ خاص طور سے ملک کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے آئی آر اور پولیٹیکل سائنس کے طلباء و طالبات نے نہ صرف یہ کہ اس سیریز سے استفادہ کیا بلکہ سیریز کے بنیادی نکتہ نظر پر مکالموں کا اہتمام بھی کیا۔ یہی اظہار دلچسپی، اختلاف و اتفاق، مباحثے و مکالمے کتاب کی صورت میں اس سیریز کے شائع ہونے کا سبب بنے۔

محمد یونس عالم

تبصرہ

مذہب و سیاست کا عملی تعلق دورِ حاضر کی مسلم ریاستوں کو درپیش سب سے اہم چیلنج ہے۔ اسے ہم دین و سیاست کی یک جائی بھی کہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں سیکولرازم کے بالمقابل ایک سیاسی تصور (Political Theory) کی تشکیل۔

بیسویں صدی کے پہلے نصف میں، مسلمان اہلِ علم نے اس باب میں وقیع علمی کام کیا۔ عالمی سطح پر یہ سیاسی نظاموں کا دور ہے۔ اشتراکیت اور سرمایہ داری، دونوں کو سیاسی نظام کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ مسلمان اہلِ دانش نے خیال کیا کہ اسلام کو بھی اگر ایک نظام کے طور پر دنیا کے سامنے رکھا جائے تو ہمارا نظری تشخص برقرار رہے گا۔ اسی عرصے میں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور اس کی افادیت مسلمہ ہے۔ تاہم اُس وقت یہ ایک نظری بحث تھی۔ اکثر مسلمان ریاستیں اغیار کے قبضے میں تھیں اور مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ مسلمانوں کو ابھی نظام سازی کا عملی چیلنج درپیش نہیں تھا۔ یہ مرحلہ بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں درپیش ہوا۔ اس دوران میں مسلمان ممالک میں چار نظام ہائے حکومت قائم ہوئے۔ شہنشاہیت، فوجی آمریت، پاپائیت اور مغربی جمہوریت۔ شہنشاہیت مشرقِ وسطیٰ اور عرب ممالک تک محدود رہی۔ فوجی آمریتوں کا دائرہ عراق سے پاکستان تک پھیلا ہوا ہے۔ پاپائیت کے حوالے سے ایران اور طالبان کا افغانستان ہمارے سامنے ہیں۔ جمہوری تجربات افریقہ میں ہوئے اور ایشیا میں بھی۔

ان سب تجربات میں، کہیں کم کہیں زیادہ، مذہب کو اہمیت دی گئی۔ سعودی عرب میں، مثال کے طور پر شہنشاہیت ہے لیکن ریاست کا عمومی تشخص مذہبی ہے۔ تاہم سب مقامات پر برسرِ اقتدار طبقے اور مذہب کی تعلیمات کے مابین ایک تضاد موجود رہا ہے اور ان طبقات نے خود کو تبدیل کیے بغیر، زبانِ حال سے اصرار کیا کہ ان کے قائم کردہ نظام کو اسلامی قرار دیا

جائے۔ شہنشاہیت پر تنقید نہ کی جائے اور فوجی آمریت کو بھی خلافت ہی کی ایک صورت سمجھا جا ئے۔ اب تمام تجربات میں اگر کہیں ارتقا اور تنقید کا کوئی گزر تھا تو وہ جمہوریت میں تھا۔ یہی سبب ہے کہ جو مسلم سماج نسبتاً زیادہ جمہوری تھے، وہاں فکری ارتقا سامنے آیا اور ساتھ ہی سیاسی نظام کی سطح پر بھی نئے تجربات کیے گئے۔ دیگر تمام نظاموں میں آمریت ہی مختلف لباسوں میں جلوہ گر تھی۔ جمہوری معاشروں میں ترکی، ملائشیا اور انڈونیشیا نمایاں ہیں۔ ترکی کا تجربہ بعض پہلوؤں سے خصوصی توجہ کا حامل سمجھا گیا۔

اس بحث کا ایک پہلو ان اسلامی تحریکوں کی حکمت عملی کا جائزہ بھی ہے جو اسلام کے سیاسی انقلاب کے لیے برپا ہوئیں اور جن کے نظریاتی تشخص کو 'سیاسی اسلام' کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے۔ ترکی اور مصر میں اسلام پسندوں کا برسر اقتدار آنا، خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی کامیاب حکمت عملی کے باعث ممکن ہوا۔ اسی وجہ سے دنیا بھر میں سماجی و سیاسی علوم کے ماہرین اور سیاسی تجزیہ نگار اسے اپنا موضوع بناتے رہے ہیں۔ اس باب میں ایک سوال یہ ہے کہ پاکستان جیسے ملک میں اسلامی تحریک کیوں کامیاب نہیں ہوئی اور کیا اس کے لیے ترکی اور مصر کے تجربات میں کوئی سبق ہے؟ میرے عزیز دوست یونس عالم نے بھی ترکی اور مصر کے تجربات کا جائزہ لیا ہے اور پاکستان پر اسے منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انہیں نے اس کا حق ادا کیا ہے۔ اردو میں اکا دکا تحریریں تو ہمیں ملتی ہیں لیکن بہت کم اہل قلم نے اسے یونس عالم صاحب کی طرح ایک مربوط سلسلہ مضامین (کالموں) کا موضوع بنایا ہے۔

ان کالموں میں ترکی کا تاریخی پس منظر، اسلامی تحریک کی جدوجہد اور حکمت عملی، ترکی سماج اور عصری مسائل کے تناظر میں اس کامیابی کا جائزہ لیا گیا جو جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کا مقدر ٹھہری۔ یہاں اس داستان کا دہرانا تحصیل حاصل ہے کیونکہ یہ کتاب کے متن میں بیان کر دی گئی ہے۔ مجھے اس باب میں دو اضافی باتیں کہنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان کالموں کی اشاعت کے بعد سے اب تک، بہت سا پانی پلوں کے نیچے سے بہہ گیا ہے۔ دوسرا یہ کہ پاکستان کیسے ترکی کے تجربے سے کوئی سبق سیکھ سکتا ہے۔

ترکی میں، معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اور سیکولرازم کی کشمکش ایک بار پھر سر اٹھا رہی ہے۔ دوسرا

Scanned with CamScanner

یہ کہ خود اسلام پسندوں کے مابین اختلاف رائے کی خلیج بڑھ رہی ہے۔ بعض حکومتی اقدامات سے یہ تاثر لیا جارہا ہے کہ طیب اردغان ارتکازِ اقتیار کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وہ آنے والے انتخابات میں ممکنہ طور پر صدارتی امیدوار بھی ہیں۔ اسی طرح ان کے بعض فیصلوں کے بارے میں یہ توجیہہ کی جارہی ہے کہ اس سے ریاستی سطح پر مذہبی تشخص کو ابھارا جارہا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بات کو زیب داستان کے لیے بڑھایا جارہا ہے اور مغرب کا میڈیا اس حوالے سے متحرک ہے۔ میرے نزدیک اس بحث سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی کامیابی ان کی سابقہ گڈ گورننس کی وجہ سے ہوئی یا نظریاتی تشخص کے باعث؟ اگر پہلی بات درست ہے تو پھر اس حکومت کو زیادہ توجہ گورننس پہ دینا پڑے گی اور مذہب کے معاملے کو ریاست کے بجائے سماجی سطح پر منظم کرنا پڑے گا۔ اگر یہ تجزیہ درست ہے تو یہ بحث ایک دوسرے نکتے سے جڑ جاتی ہے جس کا تعلق فتح اللہ گولن کی تحریک سے ہے۔

گزشتہ کچھ عرصے میں طیب اردغان اور فتح اللہ گولن کے مابین اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک دونوں ایک دوسرے کے دست و بازو تھے۔ اسی وجہ سے اے کے پی کی انتخابی فتح ممکن ہوئی۔ تاہم اس جماعت کے برسر اقتدار آنے کے بعد حالات ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ یہ معلوم ہے کہ گولن تحریک سے متاثرین ریاست کے تمام شعبوں میں موجود ہیں اور بااثر بھی ہے۔ اردغان حکومت کو شکوہ ہے کہ بیوروکریسی اور فوجی اسٹیبلشمنٹ میں پائے جانے والے یہ عناصر ان کی حکومت کو عدم استحکام سے دوچار کر رہے ہیں۔ گولن کے حلقہ اثر میں شکایت ہے کہ اردغان نے غازی پارک پر احتجاج کرنے والوں پر طاقت کا غیر ضروری استعمال کیا۔ انہیں مشرق وسطیٰ کے حوالے سے حکومتی موقف سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ حکومت نے نجی تعلیمی و تربیتی اداروں پر پابندی کا اعلان کیا جہاں مختلف پیشہ ورانہ امتحانات کی تیاری کرائی جاتی ہے۔ ان میں سے ایک چوتھائی گولن تحریک کے قائم کردہ ہیں۔ یہ ایک ارب ڈالر سالانہ کا کاروبار ہے اور اس پابندی کی زد سب سے زیادہ گولن تحریک پر پڑے گی۔ بعد میں ایک حکم کے تحت ان اداروں کو ۲۰۱۵ء تک کام کرنے کی اجازت دی گئی ہے لیکن حکومت نے خطرے کی گھنٹی بہرحال بجادی ہے۔ دسمبر میں حکومت نے کچھ وزراء پر بدعنوانی کا الزام عائد کیا۔ اسے بھی اردغان گولن کشمکش کے تناظر

میں دیکھا جا رہا ہے۔ ان کے مابین یہ سرد جنگ سر دست شاید یہ صورت اختیار نہ کرے کہ ان کی راہیں جدا ہو جائیں کیونکہ دونوں کو اب بھی ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تاہم اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ طاقت اور اقتدار کی انسانی جبلت کس طرح سماج میں ظہور کرتی ہے۔ نظریہ، تعلیم، یہ کسی حد تک انسانی جبلتوں کی تہذیب کرتے ہیں لیکن ان کے سماجی وسیاسی کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ کشمکش ہمیں خلافت راشدہ کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال کی یاد دلاتی ہے۔ بنو امیہ اور بنو عباس کی باہمی آویزش کیا تھی؟ کیا یہی غلبے کی نفسیات نہیں تھی؟ اگر نظریہ مقدم ہے تو ترکی میں گولن اردغان جھگڑا کیا ہے؟ جب یہ سوال اٹھتا ہے تو میں اس بنیادی بحث سے صرف نظر نہیں کرسکتا کہ مذہب اور سیاست کا باہمی تعلق کیا ہے؟

اہل مغرب نے ایک مدت تک کلیسا اور سیاست کو ہم آہنگ کرنا چاہا لیکن بالآخر دونوں کی علیحدگی پر اجماع کرلیا۔ عالم اسلام ابھی تجربات سے گزر رہا ہے۔ ترکی کا تجربہ اس باب میں تازہ ترین ہے۔ میں اس فرق سے واقف ہوں جو مسیحیت اور اسلام میں بیان کیا جاتا ہے لیکن میں ان تجربات کو بھی نظر انداز نہیں کرسکتا جو عالم اسلام میں کیے گئے۔

مسلمانوں کی اکثریت یہ خیال کرتی ہے کہ قرب قیامت میں، دین و دنیا کا مثالی امتزاج وجود میں آئے گا جب خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہوگی اور امام مہدی تشریف لائیں گے۔ ساتھ ہی مسلمان یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ یہ الہامی فیصلہ ہوگا۔ یعنی یہ کسی انسانی کاوش کا حاصل نہیں ہوگا بلکہ اس لیے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے اس کا فیصلہ کررکھا ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اس سے پہلے کیا ہوگا اور اس باب میں ہماری ذمہ داری کیا ہے؟ اہل تشیع کی طرف سے آیت اللہ خمینی صاحب نے 'ولایت فقیہہ' کے عنوان سے اس کا جواب دیا ہے۔ اہل سنت والجماعت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی فریضہ اقامت دین کے عنوان سے اسلامی ریاست کے قیام کو مسلمانوں پر فرض قرار دے چکے۔ کوئی مولانا مودودی کو مانے نہ مانے، ان کی اس تعبیر کو سب مانتے ہیں۔ تاہم یہ تعبیرات، جیسا کہ میں نے عرض کیا، اس وقت سامنے آئیں جب ہمارے لیے یہ معاملہ عملی سے زیادہ نظری تھا۔ اب ولایت فقیہہ کے تحت ایران میں ایک نظام قائم ہوئے، تینتیس سال ہوگئے۔ سنی ریاستیں بھی ایک سے زیادہ تجربات کرچکیں۔ اب کیا فرماتے

ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلے کے؟

پاکستان میں، اس بات کا کتنا امکان ہے کہ ترکی جیسا تجربہ کیا جا سکے؟ یہاں کے سماجی حالات اور تاریخی پس منظر، ترکی سے کتنے مماثل اور کتنے مختلف ہیں؟ میرا خیال ہے معاصر تجربات بالخصوص ترکی کی سیاست کے گہرے مطالعے کے بغیر، کوئی 'فتویٰ' دینا مشکل ہے۔ برادرم یونس عالم نے اس باب میں ہماری مدد کی ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد اور مبسوط کاوش ہے۔ یونس صاحب کو اللہ نے لکھنے کا سلیقہ عطا کیا ہے۔ اس نے ان مضامین کو دلچسپ اسلوب دے دیا ہے۔ واقعات کا تسلسل ایک کہانی کا تاثر دیتا ہے اور یوں ایک سنجیدہ تجزیہ، غیر محسوس طریقے سے غور وفکر کے دریچے وا کرتا چلا جاتا ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ یہ مضامین جس جذبے کے ساتھ لکھے گئے، اسی جذبے سے پڑھے جائیں اور کالم نگاری میں سنجیدہ تجزیے کی روایت مستحکم ہو۔

خورشید ندیم

کالم نگار: روزنامہ دنیا

اینکر: پاکستان ٹیلی ویژن نیٹ ورک

۲۰۔ دسمبر ۲۰۱۳ء۔۔۔راولپنڈی

منتخب کیا۔ جی ہاں وہ ترکی جس کی بے مثال ترقی اور انداز حکمرانی نے مسلم معاشروں کو ترقی اور جدو جہد کا نیا راستہ دکھایا۔ ترکی کے حوالے سے میری خوشی کی ایک بڑی وجہ ہے کہ مجھ سمیت اب پاکستان کا نوجوان ترقی اور کامیابی کے لیے ترکی کا ماڈل اپنانے کا سوچتا ہے۔ ترکی انتہا پسند ماڈل نہیں بلکہ جدید دنیا سے ہم آہنگ ماڈل ہے۔

دوسری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ یار من اور رفیق من یونس عالم کی پہلی کتاب آپ کے ہاتھوں کی زینت ہے۔ دوست کو دکھی دیکھ کر دکھ مزید بڑھ جاتا ہے لیکن دوست کو خوش دیکھ کر بھی۔۔۔ دکھ ہی ہوتا ہے۔ جب ایک بہترین کتاب آپ پڑھیں گے تو یقینی طور پر آپ یونس عالم کی تعریف کریں گے تو اس اصولی طور پر مجھے تکلیف ہی ہوگی۔ لیکن میرا معاملہ اس باب میں تھوڑا مختلف ہے ۔ یونس عالم کے ساتھ لمبی لمبی نشستیں، طنز و مزاح، کئی موضوعات پر گھنٹوں کی گفت گو، کئی معاملات پر اختلاف، اور کئی موضوعات پر خواہ مخواہ کا اختلاف اور کئی مشترکہ منصوبے بھی شامل ہیں۔ میری خوشی کا دوسرا احساس۔۔۔ یہ کتاب ہے۔ کالموں کا مجموعہ، جو سوچنے کی طرف ایک دعوت ہے ۔۔ جو آپ میں کچھ کرنے کی لگن پیدا کرتا ہے۔ خوبصورت تحریریں، جو گرم جذبات اور شدت بھرے احساسات کا قبلہ ہیں۔ گرمیوں میں پڑھیں گے تو جسم میں سردی دوڑ جائے گی اور سردیوں میں پڑھنا چاہیں تو کمرے کی کھڑکی کھول کر پڑھیے گا اور میسر ہو تو دماغ کی بھی۔۔۔ یونس عالم کی ان تحریروں میں اس نے دماغ کے ساتھ دل کا بھی بھرپور استعمال کیا ہے۔ وہ دماغ جو حالات پر کڑھتا رہتا ہے اور وہ دل جو حالات کی بہتری کے لیے تڑپتا رہتا ہے۔ جون، جولائی کی گرم راتوں سے لیکر دسمبر اور جنوری کی سرد شاموں میں ہونے والی گفت گو کے نتیجے میں یونس عالم کے جسم سے جو شخص برآمد ہو کر نکل کھڑا ہوا، اس کا نام یونس عالم ہے۔ میں نے اسے گفت گو کے ذریعے برآمد کیا، آپ اسے پڑھ کر برآمد کریں۔

سبوخ سید

جیو ٹیلی ویژن نیٹ ورک

اظہار تشکر

مجھے یہاں کچھ ایسے لوگوں کا شکریہ ادا کرنا ہے جو میری دنیا کے بڑے لوگ ہیں۔

نہ سمجھو تو قلم ایک رقاصہ ہے جس پر پیسہ پھینکو تو وہ الفاظ کا مجرا دکھاتا ہے اور سمجھو تو ضمیر کی ایک عدالت ہے جس میں پیش ہوتے ہوئے دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک ذمہ داری ہے جس کو احساس ذمہ داری کے ساتھ ہی اپنے کاندھوں پر لیا جا سکتا ہے۔ یہ مشکل کام تب بہت آسان ہو جاتا ہے جب کسی ماہر کی نگاہ انتخاب آپ پر لگ جائے۔ ہاتھ پکڑ کر وہ آپ کو الف بے پڑھائے۔ دیکھنے اور سننے کی صلاحیت کو بتدریج بڑھائے۔ زندگی کو نئی رخ سے دیکھنے کا ہنر دے۔ بولنے اور لکھنے کا ڈھنگ عطا کرے۔ اسی کے بعد آپ کوئی فیصلہ کر پاتے ہیں۔ درست انداز میں نئی راہ کا انتخاب کر پاتے ہیں۔ فیصلہ کی قوت اپنے اندر محسوس کرتے ہیں اور لکھنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ میرا تحریری ذوق جس کی نگاہ انتخاب کا کرشمہ ہے وہ رعایت اللہ فاروقی صاحب ہیں۔

اس معاشرے میں جو کام سب سے مشکل ہے وہ کسی کی حوصلہ افزائی ہے اور حوصلہ شکنی کا کام قومی فریضے کے طور پر یہاں انجام دیا جاتا ہے۔ کبھی آپ کو لگتا ہے میری آواز صدا بصحرا ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے میرے الفاظ نقار خانے میں طوطی کی صدا جیسے ہیں۔ کبھی یوں بھی لگتا ہے جیسے گونگوں کے شہر میں ہم آباد ہیں اور کبھی یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ بینائی سے یہاں ہر شخص کو محروم کر دیا گیا ہے۔ ایسے میں کبھی سفر کے آغاز پر ہی انسان تھک ہار جاتا ہے۔ ایسے میں کوئی خضر زندگی کے کسی موڑ پر مل جائے تو تقدیر سنور جاتی ہے۔ تحریر کے شعبے میں قدم رکھتے ہی میں نے ہتھیار رکھ دیے تھے۔ ذمہ داری اٹھاتے ہی ہاتھ اٹھا لیے تھے، کہ میری بس ہے۔ ملیر کی سڑکوں پر ایک شام میرا دوست ملنے کو آیا۔ اس نے صرف ایک بات کی: یار لکھتے کیوں نہیں ہو؟ تمہارے ہر کام سے بڑھ کر ضروری کام یہ ہے کہ تم لکھا کرو۔ یقین جانیے یہ پہلا شخص تھا جس کے الفاظ اس کے خلوص

اس کے دردِ دل کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کے اصرار پر بجھے دل کے ساتھ ایک کالم لکھا اور یوں لکھتا ہی چلا گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن یہ قلم پھر رکا نہیں ہے۔ اسی کے بعد سے حقیقی معنوں میں ایک لکھاری اور اس کے قاری کا رشتہ سمجھ آیا۔ اسی رشتے کا اثر ہے کہ اب بہر طور لکھنا ہی پڑتا ہے۔ اس کا کریڈٹ میں منور راجپوت کے سوا کسی کو دے نہیں سکتا۔

کبھی آپ کو زعم بہت ہوتا ہے۔ تقریر کا زعم۔ تحریر کا زعم۔ مطالعے کا زعم۔ تجزیے اور تبصرے کا زعم۔ یہ زعم انسان کو دیمک کی طرح چاٹ جائے اگر بر وقت نشاندہی نہ ہو۔ یہ وہ تباہی ہے جس کی خبر تباہ ہونے والے شخص کے سوا ہر کسی کو ہوتی ہے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ دوسرے ظہور میں ادارتی صفحے کی ذمہ داری ایک ایسے شخص کے پاس تھی جو زعم کی دنیا کو توڑ دینے کی طاقت رکھتا تھا۔ کیوں کہ وہ خود ماہر فن اور صاحب مطالعہ شخص تھا۔ بلاشبہ اس شخص کی بے باک تنقید نے میری کئی مشکلوں کو بہت جلد آسان کر دیا۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے بھی میں کیوں ہچکچاؤں کہ میری تحریر کی شین قاف درست کرنے والوں میں اس کا کردار کلیدی ہے۔ اس کے لیے میں عنایت الرحمٰن شمسی کا ہمیشہ شکر گزار رہوں گا۔

کسی جرم کی سزا بھگتنا بہت آسان ہوتا ہے اور ناکردہ جرم کی سزا بھگتنا مشکل تر۔ کبھی یوں ہی بے وجہ آپ کو دھتکار دیا جاتا ہے۔ بے سبب راندۂ درگاہ کر دیا جاتا ہے۔ سارے دروازے آپ پر بند کر دیے جاتے ہیں۔ اسباب و عوامل کی تلاش میں سرگرداں انسان کو اپنی خطا کا سراغ نہیں لگتا تو تنہائیاں کا احساس ڈسنے لگتا ہے۔ پھر سارے راستے مسدود دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں کوئی شخص اپنے سارے دروازے کھڑکیوں کے سمیت کھول کر آپ کی صلاحیتوں کو پناہ دے تو کیسا محسوس ہوتا ہے؟ اگر وہ سزائیں نہیں بھول سکتا جو بغیر کسی جرم کے دی گئیں، تو یہ کیسے بھول جاؤں کہ جب سارے دروازے بند ہوئے تو ایک شخص نے اپنے دروازے مجھ پر کھول دیے۔۔۔ رفیق افغان صاحب! مولا سلامت رکھے آپ کو۔

کبھی آپ فیلڈ میں آ جانے کے بعد بھی سرگرداں رہتے ہیں۔ کہیں کچھ خلا خلا سا محسوس ہوتا ہے۔ کسی کمی کا اور کوتاہی کا احساس اندروں میں جاگتا رہتا ہے۔ جس سمت پر چل رہے ہوتے ہیں وہاں کئی خدشات کا سامنا ہوتا ہے۔ کئی سوال ہوتے ہیں جس کا جواب نہیں مل پاتا۔ کبھی تو یہ

جواب بڑے بڑوں سے بھی نہیں مل پاتا۔ ایسے میں کسی کی ایک رائے کسی کے دو بول کسی کا ایک مشورہ کسی کی ایک تجویز آپ کے دل کو طمانیت بخش دیتا ہے۔ فکر کی دنیا میں ایک قرار سا واقع ہو جاتا ہے۔ حوصلے کے ساتھ آپ قدم بڑھاتے ہیں۔ یقین کے ساتھ آپ ہدف کا تعین کرتے ہیں۔ آپ اپنی علمی و فکری کم مائیگی کے باوجود تلخ اور کرخت موضوعات پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ آپ کتاب کی صورت میں اسے منظر عام پر لانے کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ سبوخ سید کیا بات ہے آپ کی!

میں نے سوچا نہیں تھا کہ یہ سیریز کتابی شکل میں بھی شائع ہونی چاہیے، مگر یہ ناممکن سا کام بھی ممکن ہو گیا۔ ناممکن کا امکان کچھ لوگوں کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ شاید مدثر عباسی کی زندگی میں بھی نہیں ہے۔

ایک وضاحت

چونکہ زیرِ نظر کتاب دراصل روزنامہ ''امت'' میں شائع ہونے والے کالموں کا مجموعہ ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ کتاب کے مطالعے سے قبل درج ذیل وضاحت کو مدنظر رکھا جائے۔

۱۔ ترکی کے حوالے سے جو سیریز لکھی گئی وہ ایک ماہ قبل استنبول میں پیدا ہونے والے ایک سیاسی بحران کے تناظر میں لکھی گئی۔ ترک حکومت گیزی پارک کو ختم کرکے وہاں ایک شاپنگ مال اور مسجد بنانا چاہتی تھی جس پر اپوزیشن کی طرف سے سخت ردعمل دیکھنے میں آیا۔

۲۔ اسی طرح مصر اور اخوان المسلمون کے حوالے سے جو سیریز شائع ہوئی وہ مصر کی حالیہ فوجی بغاوت کے تناظر میں لکھی گئی تھی۔

۳۔ روزنامہ امت میں ترکی اور مصر کی یہ کالمی سیریز کالم نگار کے قلمی نام ''محمد فرتو عالم'' کے ساتھ شائع ہوئی تھیں جو اب ترک کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا اب یہ کتاب محمد فرتو عالم کے بجائے اصل نام ''محمد یونس عالم'' کے ساتھ شائع کی جارہی ہے۔

۴۔ اگرچہ یہ کتاب کالموں کا مجموعہ ہے مگر استفادے کے دائرے کو بڑھانے کے لیے یہاں شائع شدہ کالم ضروری ترمیم و اضافے کے ساتھ شائع کیے جارہے ہیں۔

۵۔ ظاہر ہے کہ تصنیف اور کالم نگاری دو مختلف اسلوب ہیں اس لیے کتاب کو قابلِ ہضم بنانے کے لیے کالموں کے اسلوبِ تحریر میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ کوشش کے باوجود اس کتاب کو کافی حد تک کالم کے اسلوب میں ہی برداشت کرنا پڑے گا۔

شکریہ

مصطفیٰ کمال اتاترک کا ترکی!

ترکی کا حالیہ سیاسی بحران حقیقی معنوں میں دو مختلف سوچوں کا تصادم ہے۔ یہ نظریاتی جنگ ایک تسلسل کی کڑی ہے۔ وہ تسلسل جس کا آغاز اسی برس قبل اس وقت ہوتا ہے جب خلافت عثمانیہ کا سفینہ ناخداؤں نے ڈبو دیا۔ ڈوبتی ہوئی اس ناؤ میں ترکی فوج کے ساتویں کور کے کمانڈر مصطفیٰ کمال اتاترک نے خود کو سنبھالا۔ وہ اول و آخر ایک ترکی ہی تھا۔ حالات کے ساحل پر کھڑے اتاترک نے ڈوبتی ہوئی ناؤ کو دیکھا اور فیصلہ کیا، کہ سلطنت عثمانیہ کے بادشاہ ڈوبتے ہیں سو ڈوبیں مگر ترکی افواج کو منظم کر کے میں دشمن کی اینٹ سے اینٹ بجادوں گا۔ وہ استنبول میں تھا تو خلیفہ عبدالحمید کے خلاف جاری سرگرمیوں میں اس کا ہاتھ نظر آیا۔ اس جرم کی پاداش میں اسے جیل کی سلاخیں دیکھنی پڑ گئیں۔ مصطفیٰ کمال ویسے ہی سلطنت عثمانیہ پر خار کھائے بیٹھا تھا جیل نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا۔ قید و بند کے اس عرصے نے مصطفیٰ کمال اتاترک کو یکسوئی کے ساتھ سوچنے کا وقت فراہم کیا۔ اپنے تئیں اس نے کئی باتوں پر غور کیا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال پکنے لگا کہ سلطنت عثمانیہ کے ان آخری خلفاء کا رویہ آمرانہ ہو چکا ہے۔ انہوں نے سوچنے سمجھنے پر پابندی عائد کر کے من مانے فیصلے نافذ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ میرے خیالات شاہوں کے طبع نازک پر گراں گزرے تو اٹھا کر پابند سلاسل کر دیا۔ سو اس معاشرے کو ایک ''روشن خیال'' اور ''آزاد خیال'' معاشرے کے طور پر ابھرنا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے ''ماڈرن ترکی'' کی طرف ہم کو سفر کرنا ہوگا۔ رہا ہوتے ہی مصطفیٰ کمال اس سفر پر نکل پڑا۔ اپنے ہدف تک رسائی کے لیے اس نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی۔ دمشق فوجی ہیڈ کوارٹر سے اس نے اپنی عسکری ملازمت کا آغاز کیا۔ اس دوران جمعیت اتحاد و ترقی کے ان راہنماؤں سے اس نے مراسم بڑھا لیے جو نئے ترکی کی تشکیل کے لیے خفیہ یا اعلانیہ سرگرم تھے۔ اور دوسری طرف جنگ اطالیہ اور جنگ بلقان میں اپنی عسکری مہارت کا بھرپور مظاہرہ کر کے خود کو اس نے ایک جرات مند اور جینئس کمانڈر کے طور

پر منوالیا۔ پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر وہ ملٹری اتاشی کے طور پر کام کر رہا تھا مگر اس کے اندر کا فوجی اگلے محاذوں کے لیے بے تاب تھا۔ 1915 میں اس نے سربراہان سے درخواست کی کہ مجھے فوج کے کسی دستے کی کمانڈ دے کر اگلے محاذوں پر بھیج دیا جائے۔ مصطفیٰ کمال کا ٹریک ریکارڈ دیکھتے ہوئے درخواست منظور کر لی گئی۔ اس کی تشکیل آبنائے باسفورس کی طرف کر دی گئی جہاں انگریز اور فرانسیسی افواج سے سخت معرکہ درپیش تھا۔ اسی سال یعنی 1915 کے وسط میں چند ماہ کی مدت میں مصطفیٰ کمال نے فرانسیسی افواج کو پسپا کر دیا۔ آبنائے باسفورس کا دفاع ناقابل تسخیر ہو گیا۔ اس ناقابل یقین فتح کے بعد مصطفیٰ کمال کا راستہ روکنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہو گیا۔ اس کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو گئی۔ فرانسیسی افواج کو شکست سے دوچار کرنے پر مصطفیٰ کمال کو جنرل رینک پر پروموٹ کر دیا گیا۔ اپنی پروموشن کے پہلے ہی سال اس نے روسی افواج کو شکست دے کر ترکی کا مقبوضہ علاقہ بھی آزاد کروالیا۔ اس کارنامے پر 1917 میں مصطفیٰ کمال کو اہم محاذوں پر برسرپیکار ساتویں فوج کا کور کمانڈر لگا دیا گیا۔ 30 اکتوبر 1918 کو جب معاہدہ امن پر دستخط ہوئے تو مصطفیٰ کمال کو تمام ذمہ داریوں سے فارغ کر کے نئی ذمہ داریاں دینے کے لیے استنبول بلوالیا گیا۔ سلطنت عثمانیہ کے چھتیسویں فرمانروا خلیفہ وحیدالدین سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ خلیفہ کی نظر مصطفیٰ کمال اتاترک پر پڑتی تو اس کی عسکری مہارت اور انتظامی صلاحیت پر رشک کرتا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ اس بات پر فخر کرتا کہ مصطفیٰ کمال جیسا بہادر اور محب وطن سالار اسے نصیب ہوا ہے۔ مگر اسے خبر نہیں تھی کہ ترکی کی محبت کا دم بھرنے والے مصطفیٰ کمال کے دماغ میں سلطنت عثمانیہ کے لیے نفرت کس ڈگری پر ہے۔ وہ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے دربار کا ایک وفادار ہے۔ اسی بے خبری میں خلیفہ وحیدالدین نے مصطفیٰ کمال کو انسپکٹر جنرل بنا دیا۔ مصطفیٰ کمال کو اور کیا چاہیے تھا؟ اس کی تو جیسے من کی مراد بر آئی۔ کیونکہ مصطفیٰ کمال معاہدہ امن کے بعد دل گرفتہ تھا۔ امن کا یہ معاہدہ ایسے حالات میں ہوا تھا کہ یونانی افواج نے ایشیائے کوچک کے ایک بڑے حصے پر قبضہ جمائے رکھا تھا۔ ازمیر اور اناطولیہ ترکی کے قبضے سے نکل گئے۔ شام پر فرانس کا اختیار تسلیم کر لیا گیا۔ یہ وہ صورت حال تھی جو اتاترک سے کسی بھی صورت ہضم نہیں ہوئی۔ فوج کے انسپکٹر جنرل کے طور پر اتاترک کی بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ افواج سے باقی ماندہ اسلحہ واپس لے کر اسلحہ ڈپو

کے حوالے کر دے۔ مگر اسی ذمہ داری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اتاترک نے فوج کو پھر سے منظم کرنا شروع کر دیا۔ فوج سے باہر کی وہ قوتیں جو معاہدہ امن پر خوش نہیں تھیں، اتاترک نے ان کی سرپرستی شروع کر دی۔ تحریک مقاومت کو اس نے منظم کر کے ترکی کے دفاع کے عنوان سے ایک بغاوت کھڑی کر دی، جس کے نتیجے میں ایک عارضی متوازی حکومت قائم ہو گئی۔

1920 میں مصطفیٰ کمال انگورہ میں ترکی کی پہلی عارضی اسمبلی کا صدر منتخب ہوا۔ اگلے ہی برس اتاترک کی قیادت میں ترکوں نے یونانیوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ اسی برس یعنی 1921 میں ترکی افواج نے یونانی افواج کو ترک سرحدات کے اس پار دھکیل دیا۔ اس کے ایک برس بعد یعنی 1923 میں اتاترک نے خلافت کے خاتمے کا اعلان کرتے ہوئے ترکی کو باقاعدہ جمہوری ریاست ڈیکلیئر کر دیا۔ باقاعدہ پہلا صدر بھی خود مصطفیٰ کمال اتاترک ہی منتخب ہوا۔ اقتدار کے ہماں کا سر پر بیٹھنا ہی تھا کہ اتاترک کا اندر کا اور جنگل انسان باہر آیا اور اگلے پچھلے سارے حساب بے باق کرنا شروع کر دیے۔ ایسی اصلاحات کیں جس نے پلک جھپکتے میں جدید ترکی کا جھنڈا لہرا دیا۔ مگر اس جدید ترکی کا محور مادر پدر آزاد معاشرہ تشکیل دینے کا سوا کچھ نہیں تھا۔ انتقام عروج پر تھا۔ بغاوت سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ فرسٹریشن انتہا پر تھی۔ سینے میں جو لاوا برسوں سے پک رہا تھا وہ ابل کر باہر آیا، جس نے تباہی مچانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ مصطفیٰ کمال نے مساجد اور مدارس پر پابندی لگاتے ہوئے جدید تعلیمی ادارے قائم کرنے کا حکم جاری کر دیا۔ عربی زبان میں اذان اور نماز پر پابندی عائد کر دی۔ حج اور عمرے کو سرکاری طور پر ممنوع قرار دے دیا۔ حجاب ٹوپی اور داڑھی قابل دست اندازی پولیس جرائم قرار دے دیے۔ مصطفیٰ کمال نے مذہبی امور کا ایک محکمہ بھی قائم کر لیا۔ مگر اس محکمے کا کام یہ تھا کہ مذہب پسند لوگوں کی کڑی نگرانی کرے۔ اسی محکمے کے تحت اتاترک نے ترکی کے انشاپردازوں کی ایک کمیٹی بھی تشکیل دی، کمیٹی کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ترکی زبان میں شامل ہو جانے والے عربی الفاظ کو ختم کر کے نہ صرف یہ کہ اس کا ترکی متبادل پیش کرے بلکہ اس کو ہر صورت رائج بھی کرے۔ مسلمان اگر اذان دینا چاہتے ہیں تو ان کے لیے اذان کے کلمات کی جگہ ترکی الفاظ منتخب کیے جائیں۔ غرضیکہ مذہب کو ترکی کی اجتماعی زندگی سے تو مکمل طور نکال دیا گیا تھا البتہ انفرادی زندگی میں اتنی چھوٹ دی گئی جتنی کہ

مصطفیٰ کمال کی طبیعت برداشت کرسکتی تھی۔

دنیا کی یہ عجیب حقیقت ہے کہ مذہب کو انتہا پسند قرار دینے والوں کی اپنی انتہا پسندی کا اسکیل ہمیشہ دوگنا اونچا رہا ہے۔ عثمانی سلطنت کے خلاف مصطفیٰ کمال کا ردعمل ایک فطری سی بات تھی کہ جہاں تگ و تاز میں اختلاف کو ایک کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ مگر یہ ردعمل مصطفیٰ کمال کو جس انتہا پر لے گیا وہ غیر دانشمندی اور حماقت سے آگے کی کوئی چیز تھی۔ مذہب اور لادینیت سے نہیں، بغاوتیں ہمیشہ غیر معتدل معاشرتی رویوں سے جنم لیتی ہیں۔ اگر معاشرے کے کسی بھی اتاترک کا خیال یہ ہو کہ سلطنتوں کی انتہا پسندیاں بغاوت کو جنم دیتی ہیں تو ان اتاترکوں کو سوچنا چاہیئے کہ اسی انتہا پر وہ خود کھڑے ہوں تو ردعمل مختلف نہیں ہوگا۔ مصطفیٰ کمال اتاترک ذہین چالاک اور اعلیٰ درجے کا شاطر منتظم تھا، مگر جذبات اگر غالب آجائیں تو بڑے بڑے شہسوار بھی اپنے ہی ہاتھوں اپنی ہی دانش کا خون کرنے میں لمحہ بھر کی دیر نہیں کرتے۔ یہی اتاترک کے ساتھ ہوا۔ جتنا فرق اس نے ترکی اور عثمانی سلطنت کے بیچ روا رکھا تھا، اتنا ہی فرق اگر وہ مسلمانوں میں اور اسلام میں کرتا تو حالات کچھ اور ہوتے۔ لیکن اس نے کسی مسلمان کا غصہ اسلام پر نکال دیا۔ اور اسلامی احکامات ہی کیا، اصطلاحات تک کو اس نے نہیں بخشا۔ ہر اس نشان کو اس نے مٹا دیا جس میں مذہب کا کوئی ثانوی عکس بھی دکھائی پڑتا تھا۔ عقیدوں اور یقینوں پر اس نے کڑے پہرے لگا دیے۔ اظہار رائے کی یک رویہ ٹریفک چلنے لگی۔ یہ مصطفیٰ کمال اتاترک کا وہ بے مثل "کارنامہ" تھا جس نے اس کی جرات، ہمت، حب الوطنی، ذہانت اور متانت کے سارے بھرم دھو دیے۔ جس انتہا پسندانہ اصلاحات کی بنیاد اتاترک نے رکھی اس نے ترکی کی مجموعی سوچ کو دو واضح حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے بعد یہ ممکن ہی نہ تھا مصطفیٰ کمال بغیر کسی مدمقابل کے میدان میں خیمے لگائے بیٹھا ہو۔ جدید ترکی کے آغاز پر ہی ایک ایسے معاشرے نے جنم لیا جس میں گھٹن ہی گھٹن تھی۔ ترکی کے مجموعی شعور نے بغاوت کا رنگ پکڑنا شروع کر دیا۔ اس ماحول نے تاریخ کا پہیہ حیران کن طور پر اس قدر تیزی سے گھما دیا کہ جس کا گمان بس ایک خوشگوار حیرت ہی ہے۔ پھر سے وہی پرانی فلم نئے کرداروں کے ساتھ چلنے لگی۔ عثمانی سلطنت میں مصطفیٰ کمال اتاترک اپنے سینے میں آگ لیے پھرتا تھا، اب یہاں اتاترک کے راج میں ایک شخص کے سینے میں بغاوت کی

آگ دہکنے لگی۔ پرانی فلم میں اپنی خواہشات کو اتاترک نے دبائے رکھ کر مناسب موقع کی تلاش جاری رکھی اور یہاں کسی اور شخص نے اپنے دماغ کے نہاں خانوں میں نئے آئیڈیاز تخلیق کرنا شروع کیے۔ اتاترک نے اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر جس طرح ترک خلفا سے ترقی پائی اسی طرح ایک شخص نے اتاترک سے اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر پروموشن حاصل کی۔ اور پھر جس طرح اتاترک نے اختیار حاصل کر کے مذہب کا ہر نشان مٹانے کی قسم کھائی اسی طرح اتاترک کے ہی ایک نور نظر نے وقت آتے ہی اختیار کی زمام ہاتھ میں لی اور ہر اس نشان کے درپے ہو گیا جس میں مصطفیٰ کمال اتاترک اور اس کی فکر کا کوئی عکس نظر آتا۔ اس شخص نے انقرہ میں مصطفیٰ کمال کے مزار کے عین سامنے ایک مسجد تعمیر کر کے ترکی کی ایک نئی تاریخ کا آغاز کیا۔ مگر یہ تاریخ کیا ہے؟ اور یہ شخص کون تھا؟۔ یہ اگلی نشست میں۔ (انشاءاللہ)

عدنان میندریس کا ترکی!

مصطفیٰ کمال اتاترک تنہا کچھ نہیں تھا۔ اس کی تمام تر جرات مندیوں اور حاضر دماغیوں سے عصمت انونو کو اگر مائنس کر دیا جائے تو صورت حال مختلف ہوگی۔ مصطفیٰ کمال کی زندگی میں عصمت انونو کا وہی کردار ہے جو سلطان صلاح الدین ایوبی کی زندگی میں ان کے انٹیلی جنس چیف علی بن سفیان کا تھا۔ آبنائے باسفورس پر فرانسیسی افواج کو شکست دینے کا موقع ہو یا روسی افواج کی پسپائی کا لمحہ، اناطولیہ کا میدان ہو یا بلقان کا محاذ، یونانی افواج کا انخلا ہو یا پھر انگریز فوج کی پسپائی، ترکی کی عارضی اسمبلی کے قیام کا وقت ہو یا پھر سلطنت عثمانیہ کے باقاعدہ خاتمے کا موقع، ہر قدم اور ہر مقام پر عصمت انونو مصطفیٰ کمال کے ساتھ نظر آئے گا۔ یہ ایک مشہور اور دلچسپ جوڑی ہے۔ 1923 میں ترکی کی پہلی اسمبلی کے قیام کے وقت مصطفیٰ کمال کو پہلا صدر منتخب کیا گیا تو عصمت انونو وزیر اعظم منتخب ہوا۔ اس منصب پر انونو چودہ برس تک فائز رہا۔ مصطفیٰ کمال مذہب کو ترکی سے مکمل طور پر بے دخل کرنے کا خواہشمند تو تھا ہی مگر اس مشکل اقدام کے لیے اس کو حوصلہ مہیا کرنے والا عصمت انونو ہی تھا۔ اگرچہ اختیارات کا مرکز خود اتاترک تھا مگر انونو سے اپنی ذہنی ہم آہنگی کو اس نے خوب انجوائے کیا۔ 1937 میں مصطفیٰ کمال کی وفات کے اگلے ہی روز عصمت انونو صدارت کی مسند پر متمکن ہو گیا۔ 1950 تک وہ اس عہدے پر فائز رہ کر مصطفیٰ کمال کی اصلاحات کو تحفظ فراہم کرتا رہا۔ مصطفیٰ کمال کا وہ کامیاب مشیر بھی تھا اور پھر فکری وارث بھی۔ مصطفیٰ کمال کی ہر سوچ کو اس نے ملک میں بھرپور انداز میں رائج کیا۔ اور عصمت انونو ہی برسر اقتدار تھا کہ جب ترکی نے اسرائیل کو ایک آزاد اور جائز ریاست کے طور پر تسلیم کر لیا۔

سلطنت عثمانیہ کے آخری دور میں اور پہلی جنگ عظیم کے دوران مصطفیٰ کمال سلطنت کے دائرے میں رہ کر اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہا تھا۔ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنیاد پر وہ براہ راست شاہان بالا سے شجاعت کے تمغے وصول کر رہا تھا۔ مگر جی ایچ کیو میں بغاوت کی کھچڑی اس نے دم

پرلگا رکھی تھی۔اپنے آئیڈیاز کو کسی کے ساتھ مکمل کر شیئر کرنے کے بجائے وہ صورت حال پیدا کر رہا تھا۔ایسی صورت حال جس کا فائدہ اٹھا کر تاج وتخت لپیٹ دیے جائیں۔ایک مناسب وقت اور مناسب منصب کی اسے تلاش تھی۔اسی کشمکش میں عصمت انونو کو اس نے جنگ کے محاذوں پر دریافت کرلیا۔ان کی کیمسٹری میل کھا گئی۔یہ دونوں ایک اور ایک گیارہ ہو گئے۔اس کے بعد سلطنت عثمانیہ کا تخت الٹ کر مذہب پر جو غضب ڈھایا گیا وہ اسی جوڑی کی کرشمہ سازیاں تھیں۔مگر عین اس وقت کہ جب مصطفیٰ کمال حسب روایت بہت تیزی سے اصلاحات کرتے ہوئے مطلوبہ ہدف کی طرف بڑھ رہا تھا،اس کے اپنے گرد وپیش میں ایک شخص کے کان کھڑے ہوگئے۔اس کا نام عدنان میندریس تھا۔عدنان میندریس ایک مضبوط پس منظر کا حامل اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔کہنے کو وہ ایک ماہر قانون تھا مگر دفاعی امور پر اس کی کمانڈ غیر معمولی تھی۔اسی لیے جب یونانی افواج ازمیر میں داخل ہوئیں تو عدنان میندریس نے ازمیر کے دفاع میں بھرپور حصہ لے کر اپنی مہارت کا لوہا منوایا۔اسی جنگ کے دوران عدنان میندریس کی ملاقات جلال بایار سے ہوگئی۔ان کی کمسٹری بھی میل کھا گئی۔یہاں سے ایک اور تاریخ ساز جوڑی کی بنیاد پڑ گئی۔جلال بایار بھی ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص تھا۔اقتصادیات سمیت کئی وزارتوں پر رہنے کے بعد وہ مصطفیٰ کمال کے آخری ایام یعنی 1937 میں وزارت عظمیٰ کے منصب پر بھی فائز ہوا۔مگر عصمت انونو کے صدر بنتے ہی اس نے وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ترکی میں بینکاری کے نظام کو فروغ دینے کا کریڈٹ بھی جلال بایار کے سر ہے۔عدنان میندریس بایار کی طرح مختلف حکومتی ذمہ داریوں پر رہا۔جلال بایار اور عدنان میندریس سیاسی ذہن کے مالک تھے مگر ترکی میں ون پارٹی سسٹم کے تحت وہ سرکاری تنظیم ”جمہور خلق پارٹی“(ریپبلکن پیپلز پارٹی)کے ساتھ کام کرنے پر ہی مجبور تھے۔سخت گیر مصطفیٰ کمال کے راج میں وہ حکومتی پالیسی پر تنقید بھی کرتے تو کام سے جاتے یا جان سے جاتے۔لیکن یہ مسئلے کا حل نہیں تھا۔ان حالات نے عدنان میندریس اور جلال بایار کی جوڑی کو مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو ایسی جوڑی کا شدید ردعمل بنا دیا۔اب عدنان میندریس ایک مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا اور اپنے آئیڈیاز جلال بایار کے ساتھ شیئر کرنے لگا۔ترکی کو جب جمہوری ریاست ڈیکلیئر کر کے غیر جمہوری اقدامات کا آغاز ہوا تو عدنان میندریس لبرل پارٹی آف

عائدن کا ایک معمولی عہدیدار تھا۔ مگر اس کی صلاحیتوں کا چرچا زبان زد عام تھا۔ انہی صلاحیتوں کو بھانپتے ہوئے مصطفیٰ کمال اتاترک نے عدنان میندریس کو پارلیمنٹ کا رکن منتخب کر دیا۔ عدنان میندریس کو اور کیا چاہیے تھا؟ قدم جمانے کو جگہ ہی تو درکار تھی۔ دست قدرت کی اپنی ہی کاری گری ہے۔ اسی کی چال سب سے بہتر چال ہے اگر کوئی فطرت کے اصولوں کی نگہبانی پر آمادہ ہو۔ جس طرح بے خبری میں خلیفہ وحید الدین نے مصطفیٰ کمال کو اس کی صلاحیتوں کی بنیاد پر انسپکٹر جنرل لگایا تھا ٹھیک اسی طرح بے خبری میں ہی مصطفیٰ کمال نے عدنان میندریس کو اس کی صلاحیتوں کی بنیاد پر رکن اسمبلی منتخب کر دیا۔ مصطفیٰ کمال کا یہ اندازہ ٹھیک تھا کہ عدنان میندریس ایک جمہوری ریاست کا علمبردار رہا ہے مگر اس کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ عدنان ایسی شدت پسند جمہوریت پر یقین نہیں رکھتا جس کی بنیاد مصطفیٰ کمال نے رکھی ہے۔ اسی لیے پارٹی کی پالیسیوں سے میندریس کا اختلاف عروج پر تھا مگر اس اختلاف کا پتہ عدنان میندریس اور اس کے خدا کے سوا جلال بایار کو تھا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے عدنان میندریس نے پارلیمنٹ میں ایک سے زائد سیاسی جماعتوں کے قیام کا بل منظور کروانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ بیشتر اراکین اسمبلی نے عدنان میندریس کی آواز پر انہماک سے کان دھرا اور بحث کا آغاز ہو گیا۔ اس حوالے سے قانون سازی کا عمل شروع ہوا تو ایک معروف اور منجھے ہوئے قانون دان عدنان میندریس کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قانون سازی کے لیے عدنان میندریس کو اہم رول دیا گیا۔ بھرپور ورک کے بعد عدنان میندریس ایک سے زائد سیاسی جماعتوں کے قیام کا بل منظور کروانے میں کامیاب ہو گیا۔ جلال بایار وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے ہی چکا تھا، جمہور خلق پارٹی کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ ایک سے زائد جماعتوں کے قیام کی اجازت ملتے ہی عدنان میندریس نے بھی تمام ذمہ داریاں حکومت کو واپس کرتے ہوئے جمہور خلق پارٹی سے استعفیٰ دے دیا۔ 1938 میں وہ سرکاری جماعت سے مستعفی ہوا اور 1946 میں جلال بایار کے ساتھ مل کر اپنی جماعت ''ڈیموکریٹک پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی۔ مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو جو ترکی کو جمہوری ریاست کے بانی ہونے کے دعویدار تھے، ان کا یہ دعویٰ کس قدر ''ٹھیک'' تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ 1950 کے انتخابات میں عدنان میندریس کی پارٹی نے جمہور خلق پارٹی کی

69 نشستوں کے مقابلے میں 408 نشستیں حاصل کرلیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی اس کامیابی نے سیکولر سیاسی قوتوں اور فوج کو آسمان سیاست پر دن میں تارے دکھادیے۔ ریپبلکن پیپلز پارٹی کو اپنی جمہوری اوقات نظر آ گئی۔ اس رسوا کن شکست کے پیچھے مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کا غیر جمہوری رویہ کارفرما تھا۔ مصطفیٰ کمال کا سب سے غیر جمہوری عمل اگر کوئی تھا تو وہ صرف یہ کہ اس نے مذہب کی آزادی پر ناقابل برداشت بندشیں عائد کردیں۔ اظہار رائے کی آزادی مکمل طور پر سلب کردی۔ مخالفین کو جیلوں میں پھینک دیا یا پھر ملک سے ہی نکال باہر کیا۔

انتخابات میں ڈیموکریٹک پارٹی کی شاندار کامیابی کے بعد جلال بایار صدر اور عدنان میندریس وزیراعظم منتخب ہوگئے۔ کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں۔ کل تک جہاں مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کی جوڑی راج کر رہی تھی وہاں آج جلال بایار اور عدنان میندریس کا طوطی بول رہا تھا۔ مگر عدنان میندریس اور جلال بایار حقیقی معنوں میں جمہوری اقدار پر یقین رکھنے والے لوگ تھے۔ انہوں نے مصطفیٰ کمال کی انتہا پسندی کا مقابلہ کامل اعتدال پسندی کے ساتھ کیا۔ مصطفیٰ کمال کی طرح ان کے دور حکومت میں مخالف راہنماؤں کو ملک بدر نہیں کیا گیا۔ انتقامی کارروائیوں سے انہوں نے احتراز کیا۔ آتے ہی انہوں نے لٹ اٹھا کر اتاترک کے ہر بت کو گرانا شروع نہیں کیا۔ بلکہ تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے اپنی اولین ترجیح ترکی کی معیشت کو بنایا۔ پہلی فرصت میں وہ صنعتیں جو سرکاری تحویل میں لے لی گئی تھیں وہ واپس نجی ملکیت میں دے دی گئیں۔ صنعت اور زراعت کو ترقی دینے کے لیے ایمرجنسی نافذ کردی گئی۔ ترکی کے بڑے شہروں میں انفرااسٹرکچر پر دن رات توجہ دی گئی۔ کچھ ہی عرصے میں کسانوں کے شب و روز میں نمایاں فرق واقع ہونے لگا۔ ترجیحی بنیادوں پر بندرگاہوں کی توسیع کر کے سرمایہ کاری کے مواقع پیدا کیے گئے۔ اس دوران اختیارات کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا گیا۔ اپوزیشن (ریپبلکن پیپلز پارٹی) کے کردار کو بھرپور سراہا گیا۔ اظہار رائے کی مکمل آزادی دی گئی۔ اختلاف رائے کو سرکاری سطح پر احترام دیا گیا۔ سیکولر راہنماؤں اور اتاترک کی اصلاحات کے حامیوں کو ریاست میں آزادانہ جینے کا بھرپور حق دیا گیا۔ اور پھر وہ وقت آیا کہ مبصرین اور تجزیہ کاروں کی اکثریت نے اس رائے پر اتفاق کرلیا کہ ترکی میں جمہوریت کا اصل معمار عدنان میندریس ہے۔ ترکی میں

جو جمہوری اقدار عدنان میندریس اور جلال بایار کے دور میں دیکھی گئیں اس کو حلیفوں اور حریفوں نے بیک زبان ''انقلاب سفید'' کا نام دیا۔ ترکی کی تاریخ میں آج بھی اس عہد زریں کو ''انقلاب سفید'' کے عنوان سے ہی یاد کیا جاتا ہے۔

ایک معتدل معاشرتی اقدار کی تشکیل اور عوامی اعتماد کے حصول کے بعد عدنان میندریس مصطفیٰ کمال کی مذہبی اصلاحات کی طرف متوجہ ہوا۔ ہر چند کہ اتاترک کی کچھ اصلاحات کا وہ خاتمہ کر چکا تھا مگر ترکی کو ترقی کی راہ پر چڑھانے کے بعد وہ یکسوئی کے ساتھ اس جانب آیا۔ جن مساجد اور مدارس کو تالے لگا دیے گئے تھے ان کو کھول دینے کا اس نے حکم جاری کر دیا۔ حج اور عمرے پر سے پابندی ختم کر کے عازمین عمرہ و حج کو اعلیٰ سہولتیں فراہم کرنے کا حکم نامہ جاری کیا۔ عدنان میندریس کے عہد میں ترکی کے مسلمانوں نے پچیس برس بعد فریضۂ حج ادا کیا۔ عربی میں اذان اور تکبیر پر عائد پابندی کو ڈیموکریٹک پارٹی نے پارلیمنٹ کی ایک قرارداد کے ذریعے منسوخ کروا دیا۔ عدنان میندریس نے تمام صوبوں میں خصوصی اہتمام کے ساتھ یہ پیغام بھجوایا کہ اب مسلمان عربی میں اذان اور تکبیر دے سکتے ہیں۔ یہ دن ترکی کی تاریخ میں ایک جشن کا دن تھا۔ پورے ترکی میں مسلمانوں میں خوشی کے ناقابل فراموش جذبات دیکھے گئے کہ آج وہ اٹھارہ برسوں کے بعد عربی میں اذان دینے جا رہے تھے۔ پورا ترکی اللہ اکبر کی سحر انگیز صداؤں سے گونج اٹھا۔ بیشتر مقامات پر موذنین کی آوازیں اذان دیتے میں بھر آئیں۔ انہیں جیسے کوئی متاع گم گشتہ پھر سے ہاتھ لگ گئی ہو۔ عدنان میندریس نے مذہبی امور کے محکمے کو پھر سے متحرک کیا۔ مگر مصطفیٰ کمال کے برعکس اس محکمے کو مذہبی ضروریات کی تکمیل کا ٹاسک دیا گیا۔ مساجد کی تعمیر پورے شد و مد کے ساتھ شروع ہوئی۔ پہلی مرتبہ اسی محکمے نے پاکستان کے سید ابوالاعلیٰ مودودی، مصر کے شیخ سید قطب اور حسن البنا شہید کی تصانیف کا ترکی زبان میں ترجمہ کیا۔ عدنان میندریس بہت ہی بردبار اور برداشت پر یقین رکھنے والا انسان تھا مگر اس کے رفقا کا کہنا یہ ہے کہ میندریس کا اگر بس چلتا تو ترکی سے ہر اس نشان کو مٹا دیتا جو مصطفیٰ کمال سے منسوب تھا۔ عدنان میندریس مذہبی نہیں بلکہ ایک لبرل سیاسی راہنما تھا مگر مصطفیٰ کمال کے غیر جمہوری رویے نے عدنان میندریس جیسے بردبار راہنماؤں کو مذہبی روایت کو تحفظ دینے کی جنگ لڑی۔ مذہب کے نام پر جو حقوق غصب کر

لیے گئے تھے وہ درحقیقت جمہوریت کی بنیادوں سے ہی متصادم تھا۔ عدنان میندریس درحقیقت اپنا ہی جمہوری حق واپس لینا چاہتا تھا۔ اب یہ حقوق مذہب سے ہی وابستہ تھے تو تاریخ پر سطحی سی نظر رکھنے والوں نے عدنان میندریس کو مذہبی راہنما کے طور پر ہی پیش کیا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عدنان میندریس نے اپنے حقوق کے حصول کے لیے اپنے اندر کے متاثرہ مسلمان کو پیش منظر پر رکھا۔ مثلاً عدنان میندریس نے مساجد کی تعمیرات کا حکم دیا تو ایک مسجد کی بنیاد اس نے انقرہ میں واقع مصطفیٰ کمال اتاترک کے مزار کے عین سامنے رکھ دی۔ اسی مسجد کی تعمیر کے لیے عدنان میندریس نے اپنی جیب سے ایک لاکھ کا عطیہ دے کر مصطفیٰ کمال کے فکری جانشینوں کے سینوں میں ایک نشتر چبھویا۔ یہی مذہبی پالیسی عدنان میندریس کے لیے جرم بن گئیں۔ ٹھیک اسی طرح ،جیسے آج کے ترکی کو ترقی کی راہ پر چڑھانے والے خالص جمہوری راہنما طیب رجب اردوگان کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ ان کی اہلیہ حجاب لیتی ہیں۔

ترکی کی آج کی صورت حال کی طرف ہم آئیں گے، مگر ترکی کے آج کے حالات میں عدنان میندریس کی حکومت کے آخری ایام کو سپردخامہ کرنا ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ عدنان میندریس کی ڈیموکریٹک پارٹی نے پہلی مدت بہت کامیابی کے ساتھ گزاری۔ ترکی کی آرمی اور مصطفیٰ کمال کی باقیات نے بہت پیچ و تاب کھائے مگر حکومت کا بہترین ریکارڈ ان کے کسی بھی اقدام میں رکاوٹ بنا رہا۔ 1950 کے بعد 1957 کے انتخابات میں بھی عدنان میندریس کی پارٹی نے بے مثال کامیابی حاصل کی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آج کی جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی اپنی کارکردگی کی بنیاد پر مستقل کامیابی حاصل کر رہی ہے۔ عدنان میندریس اور جلال بایار ترکی کے مقبول ترین راہنما بن گئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آج طیب اردوگان اور عبداللہ گل ہیں۔ جلال بایار کا اعزاز یہ تھا کہ وہ ترکی کے پہلے غیر فوجی صدر منتخب ہوئے تھے۔ اگلی مدت میں بھی وہ اسی منصب پر آئے۔ ان کا یہ جمہوری سفر جمہور خلق پارٹی کے غیر جمہوری رویہ رکھنے والے راہنماؤں اور سیکولر فوجی جرنیلوں کے لیے کسی بھی صورت قابل برداشت نہیں تھا۔ اور پھر مذہبی پالیسی؟ وہ کیسے برداشت کی جا سکتی تھی۔ اور پھر سونے پہ سہاگہ یہ کہ اپنی دوسری مدت میں عدنان میندریس اور جلال بایار نے ان تمام قوتوں کی حوصلہ افزائی شروع کر دی جو ترکی کے آئین سے سیکولرازم کی

شتوں کو نکالنے کے خواہشمند تھیں۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی اصلاحات کو تو جیسے تیسے برداشت کر لیا گیا تھا مگر جب آئین میں ترمیم کی بات آئی تو اتاترک کی اصلاحات کے حامیوں کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ لبرل فاشسٹوں کی یہی تاریخ ہے۔ فوج پر بھی ظاہر ہے کہ انہی عناصر کا غلبہ تھا۔ ان کا قبلہ اب جا کر ترکی کی حالیہ حکومت نے درست کیا ہے ورنہ اب تک صورت حال یہی تھی۔ عدنان میندریس کی دوسری مدت کے تیسرے سال یعنی 27 مئی 1960 کو فوج نے ٹیک اوور کرتے ہوئے حکومت کا دھڑن تختہ کر دیا۔ جنرل جمال گرسل برسر اقتدار آیا اور عدنان میندریس کے خلاف آئین کی خلاف ورزی کا مقدمہ قائم کر دیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی توڑ کر جماعت کے سرکردہ راہنماؤں پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ سزائے موت سنائی گئی اور 1961 میں عدنان میندریس کو ساتھیوں سمیت سولی چڑھا دیا گیا۔ عمر سیدہ جلال بایار کی سزائے موت عمر قید میں بدل دی گئی۔ اسی قید کے دوران آٹھ جلدوں پر مشتمل اپنی زندگی کی سرگزشت Ben de Yazdim ''میں نے بھی لکھا'' لکھی، پڑھنے لائق ہے۔

مصطفیٰ کمال پاشا کے آئین کو پھر سے تحفظ دیا گیا۔ مذہب پسندوں پر خدا کی زمین پھر سے تنگ کر دی گئی۔ فکر و خیال پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ پھر سے لبرل ازم کے غلاف میں لپٹے ہوئے فرسودہ دماغ مسلط ہو گئے۔ مگر کب تک؟ اور آخر کب تک؟ اس ذات کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ کارخانۂ قدرت میں ایک اور دماغ تخلیق ہونے لگا۔ ایک 34 سالہ شخص نے لبرل فاشسٹوں کی بربریت کا بغور جائزہ لیا۔ ڈیموکریٹک پارٹی کی قیادت کو اپنی آنکھوں سے اس نے سولی چڑھتے دیکھا۔ جمہوریت کو ''جمہوریت پسندوں'' کے ہاتھوں رسوا ہوتا ہوا بھی دیکھا۔ کچھ دیر کے لیے وہ رکا، کچھ سوچا، مگر حالات کا مقابلہ سمجھ داری سے ممکن ہوتا ہے۔ اس نے اپنے اندر کے دردمند انسان کو سنبھالا اور اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا گیا۔ پھر جب وہ پلٹا تو ترکی کی سیاست کا محور اس نے سیکولرازم سے موڑ کر حرم کی طرف کر دیا۔ شفاف جمہوریت کے تیسرے دور کا اس نے آغاز کر دیا۔ یہ آغاز کیا تھا؟ اور یہ شخص کون تھا؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

نجم الدین اربکان کا ترکی!

1960 کو ترک آرمی چیف جمال گرسل نے غیر جمہوری طریقے سے ایک جینوئن جمہوری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ وزیراعظم عدنان میندریس کو ساتھیوں سمیت تخت سے تختے پر پہنچا دیا۔ ان کی سیاسی جماعت ڈیموکریٹک پارٹی کو توڑ کر راہنماؤں کو ملکی سیاست سے مکمل طور پر بے دخل کر دیا۔ جلال بایار کی سزائے موت عمر کے تقاضے پر عمر قید میں بدل دی گئی۔ پارلیمان کے بحال ہوتے ہی 1966 میں جلال بایار کے سیاسی حقوق بھی بحال کر دیے گئے۔ 1974 میں سیکولر قوتوں کی خوئے جمہوریت جاگی اور حاتم طائی کی قبر پر لات مار کر جلال بایار کو تاحیات سینیٹ کی رکنیت آفر کر دی۔ یہ رکنیت ٹھکرا کر جلال بایار نے اپنی ضخیم سرگزشت لکھنے کو ترجیح دی۔

جنرل جمال گرسل کا عہد اقتدار سیکولر قوتوں کے لیے خزاں کے موسم میں بہار کا ایک تازہ جھونکا تھا۔ فوج پر مصطفیٰ کمال اور عصمت انونو کے ہمنواؤں کا غلبہ تھا۔ اگرچہ فوج اور ریپبلکن پیپلز پارٹی کے مفادات میں وقتی تصادم آیا مگر جمہوریت پسند قوتوں کی سرکوبی پر ان کا اعلانیہ و غیر اعلانیہ اتفاق موجود تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مصطفیٰ کمال کا مارشل آئین اپنی اصلی حالت کی طرف واپس جانے لگا۔ اہل حرم پر پھر سے ترکی کی زمین تنگ ہونا شروع ہو گئی۔ اب ایک مسلمان کی انفرادی زندگی سے مذہب کو مکمل طور پر نکالنا تو ناممکن ہو چکا تھا مگر اجتماعی زندگی میں مذہب کے داخلے پر کڑی پابندی رہی۔ اداروں سے مذہب کو جبراً بے دخل کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کمال کی شدت پسندانہ سوچ کو پھر سے تحفظ ملنا شروع ہوا۔ ایک بہیمانہ طرز حکومت کا پہیہ غیر فطری اصولوں پر رواں دواں تھا مگر دوسری طرف دست قدرت نے ایک ایسے انسان کی نشوونما شروع کر دی تھی جس نے فطرت کے انہی اصولوں کو زندگی بخشی تھی۔ اس شخص کی عمر یہی کوئی 34 برس تھی۔ جب عدنان میندریس کو ساتھیوں سمیت پھانسی کی سزا دی گئی وہ استنبول کی ٹیکنیکل یونیورسٹی میں مکینیکل انجینئرنگ کا اسٹوڈنٹ تھا۔ اگرچہ اس کا کوئی سیاسی پس منظر یا پیش منظر نہیں تھا مگر سیکولر قوتوں کے

غیر جمہوری رویے اس کے دماغ پر بری طرح سے اثر انداز ہوئے۔ لیکن برصغیر کے جزتالیوں کی طرح تعلیم کو چھوڑ کر وہ انتقام کی راہ پر نہیں نکلا، بلکہ میکینیکل انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کر کے پی ایچ ڈی کے لیے جرمنی چلا گیا۔ صرف دنوں کی بات تھی کہ اس شخص نے جرمنی میں اپنی تعلیمی قابلیت کا سکہ جما دیا۔ پی ایچ ڈی مقالے کے لیے اس نے ڈیزل انجن کو موضوع بنایا۔ اس کی صلاحیتوں کے اعتراف کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ مشہور زمانہ جرمن ٹینک لیپرڈ اے ون کی ڈیزائننگ ٹیم کا اس کو چیف بنایا گیا۔ چیف انجینئر کی حیثیت سے اپنی قابلیت کی دھاک بٹھاتے ہی وہ ترکی واپس لوٹ گیا۔ اپنے مادر علمی ٹیکنیکل یونیورسٹی آف استنبول میں وہ لیکچرار لگ گیا۔ 1965 کا وہ سال کہ جب جلال بایار کی سزا معاف کی گئی، یہ شخص ٹیکنیکل یونیورسٹی استنبول میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہو گیا۔ شاید یہی وہ منصب تھا جس کے حصول کے لیے وہ ترکی لوٹا تھا۔ لیبیا کی تحریک آزادی کے ہیرو عمر مختار اور افغان جہاد کے عرب سرخیل عبداللہ عزام کی طرح انہوں نے تدریسی شعبے کو ہی کامیابی کا گیٹ وے بنایا۔ اسی منصب پر رہتے ہوئے اس شخص نے اپنا سبجیکٹ پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسٹوڈنٹس کی اصلاحی تربیت کا آغاز کر دیا۔ انہیں سماج کی ضروریات اور ریاست کے فرائض کی آگاہی دی۔ انہیں معاشرتی رویوں کے اعلیٰ ترین معیار سے روشناس کروایا۔ عدل و انصاف کے فطری اصولوں کا انہیں سبق دیا۔ اسٹوڈنٹس کی توجہ اس امر کی طرف بطور خاص مبذول کروائی کہ مذہب کا ریاستی امور میں کیا کردار ہے۔ انہیں سوچنے پر مجبور کیا کہ سیاست دین سے دور ہو جائے تو نتائج کیا نکلتے ہیں۔ ملک بھر کی یونیورسٹیوں مختلف تعلیمی اداروں کے وزٹ اور تبلیغی دوروں میں اس شخص نے پورے لگن سے نوجوانوں کی ذہن سازی کی۔

آگے بڑھنے سے پہلے بتاتا چلوں کہ اس شخص کا نام نجم الدین اربکان تھا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ نجم الدین اربکان کو اندازہ ہوا کہ ذہنوں کی کھیتی پک چکی ہے اب اسے کاٹنے کا وقت ہے۔ نجم الدین اربکان نے سیاست میں حسب ضرورت حصہ لے کر سماج کو ریاست سے اپنے حقوق لینے کے لیے پر امن طریقے سے متحرک کیا۔ 1969 میں انہوں نے اپنی تمام تدریسی ذمہ داریوں سے استعفیٰ دیتے ہوئے باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے نیشنل ویلفیئر پارٹی کی بنیاد رکھی۔ پارٹی کے منشور میں نجم الدین اربکان نے واضح کیا کہ یہ پارٹی اسلامی

طرز سیاست پر یقین رکھتی ہے۔ یہ منشور پڑھتے ہی سیکولر قوتوں کے کان بجنے لگے۔ انہیں نجم الدین اربکان کے ڈھنگ ڈھب اور چال ڈھال میں ایک نیا عدنان میندریس نظر آنے لگا۔ 1070 کے اوائل میں تشکیل پانے والی جماعت نے ابھی گھٹنوں کے بل چلنا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ 1971 میں حکومت نے پابندی لگا دی۔ اس جماعت کی کل زندگی صرف ایک برس رہی۔ اگلے ہی برس نجم الدین اربکان نے ایک دوسری جماعت نیشنل سالویشن پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ اس نوزائیدہ جماعت کی عمر چند ماہ کی ہی تھی کہ ترکی میں عام انتخابات کا طبل بج گیا۔ 1972 میں جماعت قائم ہوئی اور 1973 میں انتخابات کا معرکہ درپیش تھا۔ سیکولر قوتوں نے اس سوچ کے ساتھ نیشنل سالویشن پارٹی کو انتخابات میں آزادانہ حصہ لینے دیا کہ اتنے کم وقت میں یہ جماعت کوئی سیاسی تحریک نہیں بن سکتی۔ مگر 73 کے عام انتخابات میں نیشنل سالویشن پارٹی نے گیارہ اعشاریہ آٹھ فیصد ووٹ حاصل کر کے ترکی کو ہلا کر رکھ دیا۔ یہ مجموعی طور پر 48 نشستیں بنتی تھیں۔ سیکولر آرمی اور سیاسی قوتوں کے ہوتے نیشنل سالویشن پارٹی کی یہ غیر معمولی کامیابی تھی۔ حاصل نشستوں کی بنیاد پر نجم الدین اربکان نے حکومت کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا۔ 1974 میں وہ ترکی کے نائب وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ اس دوران نجم الدین اربکان کی وجہ سے مذہب پسند افراد کے لیے کافی حد تک سہولت میسر رہی۔ مگر نجم الدین اربکان کو اس بات کا اندازہ تھا کہ جتنی میری طاقت ہے اس کے بل بوتے پر سیکولر قوتوں کا مقابلہ ممکن نہیں ہے، سو ترکی کی عوام کی خدمت پر ہمیں توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔ نیشنل سالویشن پارٹی کے ارکان اسمبلی نے اپنے حلقوں میں بھرپور ترقیاتی کام کروائے۔ دن رات ایک کر کے انہوں نے عوام کی خدمت کی۔ کیونکہ نیشنل سالویشن پارٹی کی نگاہیں 1977 کے انتخابات پر لگی ہوئی تھیں۔ بھرپور عوامی خدمت اور ترقیاتی کامیابیوں کے ساتھ نیشنل سالویشن پارٹی 77ء کے انتخابات میں گئی اور ترکی کی تیسری بڑی سیاسی قوت بن کر ابھر گئی۔ دوبارہ کامیابی کے بعد نیشنل سالویشن پارٹی کو پھر سے عوامی خدمت کا موقع ملا۔ منتخب اراکین نے بہت کم وقت میں اپنے حلقوں کی حالت بدل کر رکھ دی۔ انہوں خالص عوامی سیاست کی طرف توجہ دی۔ سادہ زندگی اختیار کی اور ہر وقت اپنے حلقے کے عوام کے لیے دستیاب رہے۔ با اخلاق سیاسی رویوں کو انہوں نے فروغ دیا۔ یہ طرز سیاست نیشنل سالویشن پارٹی کی

مقبولیت کے گراف کو تیزی سے اوپر کی طرف لے کر جا رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے اس گراف کے ساتھ ترک سیکولر جرنیلوں اور سیاست کی سانسیں بھی چڑھنے لگیں۔ ان کے کانوں میں خطرے کے الارم بڑی شدت سے بجنے لگے۔ صرف تین برس بعد یعنی 1980 میں ترک فوج کی ایما پر سیکولر راہنماؤں نے اتفاق رائے کے ساتھ نیشنل سالوشن پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا۔ نجم الدین اربکان کو ساتھیوں سمیت جیل میں ڈال کر قومی سیاست سے بے دخل کر دیا۔ کم و بیش سات برس کی یہ پابندی 1987 کے ایک ریفرنڈم کے نتیجے میں ختم ہوئی۔ جیل سے رہا ہوتے ہی نجم الدین اربکان نئے نام اور پرانے چہروں کے ساتھ پھر سے مورچہ زن ہوئے۔ وہی سوچ اور وہی نظریہ۔ 1990 کے انتخابات سر پر تھے۔ وقت کم اور مقابلہ بہت سخت تھا۔ مقابلے لیے نجم الدین اربکان نے نئی سیاسی جماعت رفاہ پارٹی (ویلفیئر پارٹی) کی بنیاد رکھ دی۔ نئی صف بندی کے ساتھ نجم الدین اربکان 1990 کے انتخابی معرکے میں اترے اور چالیس نشستوں کے ساتھ سرخرو لوٹے۔ اگر چہ سیکولرز کے مقابلے کے لیے یہ طاقت بھی ناکافی تھی مگر مسلسل اس کامیابی کے بعد ترکی کے مجموعی شعور نے اسلام کو ایک اہم ترین عنصر کے طور پر تسلیم کر لیا۔ ترکی کی اشرافیہ سمجھ گئی کہ نجم الدین اربکان درحقیقت ترکی کی اس آواز کا تسلسل ہے جسے جبری طور پر دبایا نہیں جا سکتا۔

رفاہ پارٹی کے نمائندوں نے اپنا سیاسی معیار برقرار رکھا۔ ایوان نمائندگان میں وہ مذہب پسند عوام کے لیے ایک بہت بڑی طاقت تھے۔ ہر چند کہ وہ آئین میں کسی ترمیم کی پوزیشن میں نہیں تھے مگر بھاگتے بھوت کے لنگوٹ وہ کس کر پکڑ سکتے تھے۔ دستیاب آزادیوں اور مسلمانوں کے بنیادی حقوق کے لیے وہ دباؤ ڈالنے کے لیے کافی تھے۔ اس سے بڑھ کر اپنے حلقے کے عام مسائل کے حل کے لیے ان کے راستے میں کوئی بڑی رکاوٹ نہیں تھی۔ کام کیا، اور دن رات کام ہی کیا۔ تین جماعتی اتحاد اور اپنے ریکارڈ کے ساتھ رفاہ پارٹی 1995 کے انتخابات میں اتری۔ اس بار رفاہ پارٹی نے مجموعی طور پر اکیس فیصد ووٹ حاصل کر لیے۔ سرخیل سیکولر جماعت ریپبلکن پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر رفاہ پارٹی نے حکومت بنائی۔ ایوان نمائندگان نے نجم الدین اربکان کو قائد ایوان منتخب کر لیا۔ عدنان میندریس کے بعد پہلی مرتبہ مذہب پسندوں کا ایک خالص نمائندہ وزارت عظمیٰ کے منصب پر آیا۔ وزیراعظم ہونے کی حیثیت سے نجم الدین اربکان نے پہلا نعرہ دیا کہ ہم ترک

عوام کا معیارِ زندگی بلند کریں گے۔ اس دعوے کو عملی شکل دینے کے لیے نجم الدین اربکان نے اپنے پیشرو کی طرح معیشت پر توجہ دی۔ ایک بھرپور معاشی استحکام کے ساتھ وہ ترکی کو فلاحی ریاست بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ ترکی کو صحیح معنوں میں فلاحی ریاست بنانے کا خواب پورا تو نہیں ہو سکا مگر اس سوچ کی بنیاد نجم الدین اربکان کے دورِ حکومت میں رکھ دی گئی۔ نجم الدین اربکان نے ایسی خارجہ پالیسی تشکیل دی جس میں ترکی کو مغربی بلاک سے نکلنے کا سامان ہو سکے۔ اربکان کی خارجہ پالیسی کا اہم نکتہ یہ تھا کہ خطے کی تمام چھوٹی بڑی قوتوں کو یکجا کر کے مسلمان قوتوں کا ایک اتحاد تشکیل دینا چاہیے۔ اربکان کی نظر میں قریب کے ممالک سے پینگے لے کر دور کے ممالک سے پینگے بڑھانا ایک احمقانہ خیال تھا۔ اسی سوچ کے ساتھ نجم الدین اربکان نے اسلامی ممالک کے معاشی مسائل کے حل کے لیے ڈی ایٹ نامی تنظیم کی بنیاد رکھی۔ مسلم ممالک میں صیہونی قوتوں کی مداخلت کو انہوں نے کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ ہر فورم پر انہوں نے اسرائیل کی مذمت شروع کر دی۔ فلسطین کے مسلمانوں کے لیے انہوں نے بھرپور آواز اٹھائی۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کی وجہ سے عرب دنیا سے ترکی کے تعلقات میں جو کشیدگی آ گئی تھی، اب وہ نارمل ہونے لگے۔ نجم الدین اربکان کی اس خارجہ پالیسی کے نتیجے میں ترکی کی سیاست کا محور بدل گیا۔ اب سیکولرازم کے بجائے مذہب کی حیثیت کلیدی تھی۔ ترکی نے مغربی بلاک سے سرکنا شروع کر دیا۔ سیکولر قوتوں کی برداشت ایک بار پھر جواب دے گئی۔ جمہوریت کا ڈھول پیٹنے والے مسلسل تین تجربوں کے بعد بھی ادراک نہیں کر سکے کہ سماج کا مطالبہ ریاست سے کیا ہے۔ سماج خود کو کس نظام کے ساتھ زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ وقت کی آواز کو ہر بار دبانے والوں نے پھر سے آستینیں چڑھا لیں۔ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والی رفاہ پارٹی کو ترک سیکولرز کا ہاضمہ صرف ایک برس تک ہضم کر سکا۔ اس کے بعد پیٹ میں قیامت کا مروڑ اٹھا اور 1997 کو فوجی مداخلت کے نتیجے میں رفاہ پارٹی کا تختہ الٹ گیا۔ رفاہ پارٹی کو کالعدم قرار دے کر نجم الدین اربکان کے سیاست میں حصہ لینے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی۔ مگر اہلِ جنوں کا خاصہ یہ ہے کہ ان کا جنون کبھی فارغ نہیں بیٹھتا۔ وہ ہر دم نیا زمانہ اور نئے صبح شام پیدا کرنے میں جتے ہوتے ہیں۔ قوموں کو اٹھانے والوں کے لیے ایک در بند تو سو در کھلے رہتے ہیں۔ آزاد منش لوگ تخت پر رہتے ہیں یا تختے

پہ جھولتے ہیں۔ تیسرا آپشن وہ نہیں رکھتے۔ پابندی والے سال ہی نجم الدین اربکان نے نئی سیاسی جماعت ورچو پارٹی (فضیلت پارٹی) کی بنیاد رکھ دی۔ اربکان نے میدان نہیں چھوڑا، حوصلہ نہیں ہارا، مگر یہاں سے آگے اربکان کی جماعتی کامیابیوں کا متاثر کن سفر ختم ہوا۔ اربکان سے رفقا بکھر گئے۔ نئے منشور کے ساتھ نئی صف بندیاں ہوئیں۔ خود نجم الدین اربکان عمر کے آخری حصے میں داخل ہو گئے۔ ان کی جماعتی قوت کم ہو گئی مگر اپنی فکری قوت کا پرچم ہمیشہ کے لیے انہوں نے استنبول کے سینے پر گاڑ دیا۔ نجم الدین اربکان کی سوچ اور طرز سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اس حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ترکی میں مذہب کو ریاست کے ساتھ جوڑنے کی جدوجہد نے درحقیقت سیکولرز کی انتہا پسندانہ سوچ سے جنم لیا۔ جس قدر جمہوری حقوق غصب کیے گئے اتنا ہی جمہوری حقوق کے حصول کی جدوجہد تیز ہوئی۔ اس جدوجہد نے ہی پہلے عدنان میندریس کو مذہبی راہنما بنایا اور پھر نجم الدین اربکان جیسا خالص مذہبی راہنما پیدا کر دیا۔

ورچو پارٹی کی تاریخ پر ہم رک جاتے ہیں۔ صرف اس بات کا اندازہ لگایئے کہ عدل اور انصاف کی لو جلائے رکھنے کے لیے دست غیبی نے کیا انتظامات کیے۔ عدنان میندریس کے بعد نجم الدین اربکان کو کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ سیکولرازم اور لبرل ازم سے وابستہ ''معصوم ظالموں'' نے کس قدر غیر جمہوری رنگ دکھائے۔ ترکی کو جمہوریہ کہنے والوں نے عوامی قوت سے منتخب ہونے والی ان جماعتوں کا دھڑن تختہ کیا جو حقیقی معنوں میں عدل وانصاف اور جمہوریت کی علمبردار تھیں۔ عدنان میندریس کو لٹکایا تو غیب کے پردوں سے نجم الدین اربکان کا ظہور ہوا۔ اب ہر صورت میں نجم الدین اربکان سے بھی وہ جان خلاصی چاہتے تھے۔ اب وہ تختہ دار تو نہ سجا سکے مگر راستہ روکنے کے لیے تمام غیر آئینی غیر جمہوری اور غیر اخلاقی ہتھکنڈے ضرور استعمال کیے۔ حالات کی گردشوں نے اور ڈھلتی ہوئی عمر نے نجم الدین اربکان کی رفتار میں کمی ضرور واقع کر دی مگر قدرت نے ترکی کی رگوں میں اربکان ہی کے ہاتھوں نیا خون انجیکٹ کر دیا تھا۔ تدریسی خدمات اور سیاسی زندگی کے آغاز پر نجم الدین اربکان نے استنبول کے فٹ پاتھ پر ایک لڑکے کو اخبار بیچتے دیکھا۔ غم روزگار نے اسے فٹ پاتھ پر لا کھڑا کیا تھا مگر اس کی بحری موجوں میں اضطراب بہت تھا۔ اربکان کی نگاہ انتخاب نے لڑکے کو لڑاکا بنا دیا۔ اسی نے پھر

میندریس اور اربکان کی جدوجہد کو تسلسل بخشا۔ یہی اخبار فروش ترک سیکولر قوتوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا۔ یہ کیل اس قدر درد انگیز تھی کہ تابوت میں پڑے مردے بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے ہیں۔ نوحہ گروں کی یہ چیخیں کس مائنڈ سیٹ کے یتیم ہونے کا پتہ دے رہی ہیں؟ اور یہ اخبار فروش کون تھا؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

طیب اردوان کا ترکی!

نجم الدین اربکان نے جب 1969 میں باقاعدہ سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو ان کا ہدف ترکی کا نوجوان خون تھا۔ سیاسی جماعت کی بنیاد رکھنے سے پہلے ہی انہوں نے دس برس نوجوان ذہن کو ایک پرامن انقلاب کے لیے تیار کر دیا تھا۔ اپنی پہلی جماعت کی بنیاد جب انہوں نے رکھی تو ایک متحرک نوجوان نے انہیں اپنی جانب متوجہ کیا۔ یہ نوجوان ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ مرمرا یونیورسٹی میں بزنس ایڈمنسٹریشن کا اسٹوڈنٹ تھا۔ تعلیمی اوقات کے علاوہ اس کی دو مصروفیات تھی۔ یا تو وہ فٹبال ٹورنامنٹس میں استنبول کے کسی لوکل کلب کی نمائندگی کرتا یا پھر استنبول کے فٹ پاتھ پر اخبار بیچ کر گزر اوقات کا سامان کرتا۔ دوسرے اخبار فروشوں میں اور اس میں فرق یہ تھا کہ اخبار فروشی سے زیادہ وہ اخبار بینی کرتا۔ حالات سے وہ مکمل طور پر باخبر ہی نہیں تھا بلکہ حالات پر اس کی نظر بھی بہت گہری تھی۔۔ وقت گزرنے کے ساتھ استنبول میں ایک کامیاب فٹبالر کی حیثیت سے اس کی شناخت ہونے لگی۔ اس کو ایک ذہین اور چالاک کھلاڑی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ جلد ہی اس نے فٹبال ٹیم کی قیادت بھی شروع کر دی۔ فٹبال کے میدانوں میں اس کی کارکردگی دیکھ کر ترکی کے ہر بڑے کلب نے اس نوجوان سے کلب میں شمولیت اختیار کر کے ایک پیشہ ور کھلاڑی بننے کی پیشکش کی۔ مگر والد کے منع کرنے پر اس نے ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ فٹبال کے شوق میں مست اس متحرک نوجوان کی شرافت، ایمانداری، سچائی اور خودداری نے نجم الدین اربکان کو سوچنے پر مجبور کیا کہ ذرا نم ہو یہ مٹی تو بڑی زرخیز ہے ساقی۔ دوسری طرف اخبار بیچنے والے اس نوجوان کو اخباروں میں نیشنل وائس پارٹی اور نجم الدین اربکان کی خبروں نے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اربکان نے جب تحریک اٹھائی تو ان کے وابستگان نے اس نوجوان کو بھی دعوت فکر دی۔ پہلی ہی ملاقات میں نوجوان نے محسوس کر لیا کہ جس چیز کی مجھے تلاش تھی وہ چل کر میرے پاس آ گئی ہے۔ اس نے فٹبال کا شوق ترک کر دیا اور اخبار کا دھندہ جاری رکھا۔ فٹبال کا

وقت اس نے نظریاتی اور فکری جدوجہد کو دے دیا۔اس نے ترکی میں سیکولر قوتوں کے مقابلے کے لیے یکسوئی کے ساتھ کمر کس لی ۔ جلد ہی وہ ترکی کی آواز بن گیا۔دبی ہوئی آوازوں کو اس نے حوصلہ دیا۔دکھے دلوں کی اس نے ترجمانی کی ۔آگے چل کر اس کی جدوجہد ترکی کی ایک تاریخ بن گئی ۔اورترکی نے وہ دن بھی دیکھ لیا کہ استنبول کی سڑکوں پر اخبار بیچنے والا وہی شخص خود اخباروں کی زینت بن گیا۔اب وہ لیڈر اور سپر لیڈ ہے۔وہ کون ہے؟وہ ترکی کا آج کا وزیر اعظم رجب طیب اردوان ہے۔

طیب اردوان نے اپنی تحریکی زندگی کا آغاز کمیونسٹ مخالف تنظیم نیشنل ترکش سٹوڈنٹ موومنٹ سے کیا۔اس دوران نجم الدین اربکان کی تنظیم نیشنل والس پارٹی پر پابندی لگ چکی تھی ۔اربکان نے جب نیشنل سالوشن پارٹی کی بنیاد رکھی تو طیب اردوان نے اس میں شمولیت اختیار کرلی۔اسی پارٹی میں یوتھ ونگ اور استنبول کے صدر رہ کر وہ کمیونسٹ سرکل کے لیے مضبوط اعصاب کے حریف بنے رہے۔1980 کی فوجی بغاوت کے بعد اربکان کی دوسری جماعت پر پابندی لگی تو رفاہ پارٹی کی بنیاد پڑ گئی۔اس رفاہ پارٹی کو اڑان دینے میں طیب اردوان نے کلیدی کردار ادا کیا۔دس برس تک رفاہ پارٹی میں وہ مختلف اہم ذمہ داریوں پر رہے۔رفاہ پارٹی میں ہی اردوان کا پہلا تعارف عبداللہ گل سے ہوا۔اس ملاقات نے عدنان میندریس اور جلال بایار کی طرح ترکی کے مسلمانوں کو ایک اور تاریخ ساز جوڑی مہیا کر دی۔طیب اردوان نے 1994 کے بلدیاتی انتخابات میں رفاہ پارٹی کی طرف سے حصہ لیا۔کانٹے کے مقابلے کے بعد اردوان استنبول کے ناظم منتخب ہوگئے۔اردوان ناظم کیا منتخب ہوئے استنبول کی سیکولر قیادت سناٹے میں آگئی۔انہیں تشویش ہوئی کہ طیب اردوان اب استنبول میں مذہبی ترجیحات کو مسلط کرنے کی کوشش کرے گا۔وزیر اعظم اربکان سے مل کر وہ مخالفین کو انتقام کا نشانہ بنائے گا۔مگر طیب اردگان خوش قسمتی سے بہت زیادہ زہد و اطاعت کے پیکر نہیں تھے،توکل اور فتح و نصرت کے پاکستانی تصور کے وہ قائل نہیں تھے،سو وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ عقل خدا نے استعمال کرنے کو دی ہے۔عدل کا نظام قائم کرنے کا انہیں جذبہ ضرور تھا،بخار بالکل نہیں تھا۔سو انہوں نے میئر کی نشست سنبھالتے ہی بنیادی مسائل کا ادراک کیا۔بنیادی طور پر تین بڑے مسائل ان کے سامنے

تھے۔ پانی کی ترسیل اور تحفظ کا نظام ناقص ہونے کی وجہ سے شہریوں کو پانی کی کمی کی شکایت تھی۔ آلودگی نے استنبول کے ماحول کو بری طرح سے متاثر کیا ہوا تھا۔ ٹریفک کے سنگین مسائل استنبول کے لیے بہت بڑے چیلنج بنے ہوئے تھے۔ طیب اردوان نے سب سے پہلے پانی کے مسئلے کو لیا۔ سو کلومیٹر کی ایک نئی پائپ لائن بچھا کر پہلے ہی برس پانی کی شکایت ختم کر دی۔ کوڑا کرکٹ اور غلاظتوں کے ڈھیر سے نجات کے لیے ایمرجنسی بنیادوں پر ریسائکلنگ شروع کر دی۔ بیرون ملک سے ہزاروں نایاب پودے منگوا کر استنبول کو سولہ سنگھاری دلہن بنا دیا۔ فیملی پارکوں کا ایک جال پورے شہر میں بچھا دیا۔ ٹریفک کے اژدہام سے نکلنے کے لیے استنبول شہر میں اردوان نے پچاس سے زیادہ پل تعمیر کروائے، یہ آج بھی استنبول کی تعمیری تاریخ کا بہترین ریکارڈ ہے۔ ہائی ویز کی تعمیر اس قدر تیزی کے ساتھ شروع ہوئی کہ استنبول میں ترقیاتی کاموں کے اگلے پچھلے سب ریکارڈ برابر ہو گئے۔ بھاری ٹرانسپورٹ کا لوڈ شہر کی خارجی شاہراہوں پر شفٹ کر دیا۔ کرپشن کے خاتمے کے لیے جو اقدامات کیے اس نے استنبول کو ترکی کے باقی شہروں کے لیے مثال بنا دیا۔ ترقیاتی فنڈز کی نگرانی کے لیے اردوان نے باقاعدہ ایک کمیٹی قائم کی جس کا کام صرف فنڈز پر چیک رکھنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ صرف تین سالوں میں اردوان نے استنبول شہر کی ترقی پر نہ صرف یہ کہ چار بلین ڈالر لگائے بلکہ دو بلین ڈالر کا قرضہ بھی مالیاتی اداروں کو چکا دیا۔ استنبول دنیا کا ایک خوبصورت ترین شہر بن گیا۔ قلت آب کی شکایت ختم ہو گئی۔ گندگی اور آلودگی کا نام نشان مٹ گیا۔ سڑکیں کشادہ ہو گئیں۔ دنیا بھر کے سیاح استنبول کی طرف متوجہ ہوئے۔ غیر ملکی سرمایہ کار سرمایہ لے کر استنبول پہنچنے لگے۔ شہریوں کے تمام بنیادی مسائل حل ہو گئے۔ شہر کے کندھوں سے قرضوں کا بوجھ بھی اتر گیا۔ اردوان پر عوام کا اعتماد بڑھ گیا۔ دنیا کے پانچ بڑے میئرز میں ان کا نام شامل ہو گیا۔ جب یہ سب ہو گیا، تب جا کر طیب اردوان نے استنبول میں شراب کی سر عام فروخت پر پابندی عائد کر دی۔

طیب اردوان 1997 تک استنبول کے میئر رہے۔ اسی سال وزیر اعظم نجم الدین اربکان کی حکومت پر شب خون مار کر رفاہ پارٹی کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ جماعت پر پابندی لگی تو سب سے زیادہ مزاحمت طیب اردوان نے ہی کی۔ ملک بھر میں ہونے والے مظاہروں میں ہونے والی

طیب اردوان کی سحر انگیز تقریروں نے نوجوانوں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ خوش پوش اور خوش جمال ہونے کے ساتھ طیب اردوان بہت خوش آواز بھی ہیں۔ وہ جلسوں میں تقریروں کے ساتھ ساتھ نغمے اور ترانے بھی گاتے تھے۔ استنبول کے ایک جلسے میں انہوں اسلامی نظم پڑھ کر نوجوانوں میں کرنٹ چھوڑ دیا۔ اس نظم کو اشتعال انگیز مواد قرار دے کر اردوان کو گرفتار کر لیا گیا۔ دس ماہ تک جیل میں رہنے کے بعد وہ رہا تو ہو گئے مگر اسی نظم کی پاداش میں اردوان پر انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا دی گئی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب سیکولر قوتوں کی تنگ ظرفی و تنگ نظری نے اردوان کو دل گرفتہ کر دیا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوا کہ استنبول جیسا شہر تعمیر کرنے کا صلہ کیا یہی ہے کہ ایک نظم کی پاداش میں ملکی سیاست سے ہی بے دخل کر دیا جائے؟ یہی دکھ عبداللہ گل بھی اپنے سینے میں لیے پھر رہے تھے۔ ناکردہ جرم کی سزائیں جھیلتے جھیلتے حالت یہی ہو جاتی ہے جو ان دنوں اردوان اور عبداللہ گل کی تھی۔ دونوں نے بیٹھ کر خیالات کا تبادلہ کیا۔ دونوں اس بات پر متفق ہوئے کہ ہماری ایمانداری کے چرچے ہیں۔ ہم بددیانت اور بدعنوان نہیں ہیں۔ ہم عدل و انصاف کے ہر تقاضے کو پورا کرتے ہیں۔ جمہوری روایتوں کو ہم فروغ دیتے ہیں۔ ذاتی مفادات سے ہم بالاتر ہیں۔ ہم نے عوام کی جس طرح خدمت کی وہ ایک مثال ہے۔ مگر ایک ہی چیز ہمارے گلے کا پھندا بن گئی ہے، اور وہ مذہب ہے۔ ہم ہر بار نئے سفر کا آغاز کرتے ہیں، جوں ہی اڑان کے قابل ہوتے ہیں ،ہمارے پر کاٹ دیے جاتے ہیں۔ کیا ہم یہی تماشہ دیکھتے رہیں گے کہ سرکار ہماری جماعتوں پر پابندیاں لگائے گی اور ہم نئی جماعتوں کی بنیاد رکھیں گے؟ سو ہمیں اپنی پالیسی پر غور کرنا ہوگا۔ ہمیں فی الوقت سیاست میں مذہب کے نام کو ترک کر دینا ہوگا۔ ہمیں رات دن ایک کر کے مذہب پسندوں کے علاوہ لبرل عوام کا اعتماد بھی حاصل کرنا ہوگا۔ ہمیں ایک لبرل نام کے ساتھ سیاست میں حصہ لے کر انتخابات میں بھاری اکثریت کو ہدف بنانا ہوگا۔ مگر بھاری اکثریت کے بعد بھی مذہب کے بجائے ترکی کو ترقی دینے پر زور دینا ہوگا۔ لوگوں کی زندگی کا معیار بلند کر کے خود کو ترکی کے لیے ناگزیر بنانا ہوگا۔ اتنی طاقت حاصل کرنا ضروری ہے جس کی بنیاد پر ہم سیکولر فوج اور عدالتوں پر ہاتھ ڈال سکیں۔ سیکولر فوج اور ربڑ سٹمپ عدالتوں کا شکنجہ کے بغیر ہم سیکولر آئین پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ سو پہلی ترجیح ترقی یافتہ ترکی ہونی چاہیے۔ اس کے بعد

فوج اور اس کے بعد سیکولر آ ئین۔

طیب اردوان اور عبداللہ گل نے اپنے ان خیالات کو ور چو پارٹی کی قیادت کے سامنے رکھا ۔اکثریت نے اردوان کی تھیوری سے اتفاق کیا مگر اعلی قیادت میں اس سوچ کو پذیرائی نہیں مل سکی ۔تمام تر کوششوں میں ناکامی کے بعد طیب اردوان اور عبداللہ گل نے اپنے ساتھیوں سے مل کر 2001 میں ایک الگ جماعت "جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی" (انصاف و ترقی پارٹی) کی بنیاد رکھ دی۔طیب اردوان نے اپنی جماعت کو ایک لبرل جماعت کے طور پر متعارف کروایا ۔انہوں نے اپنے اور عوام کے بیچ حائل ہر دیوار کو پوری حکمت اور تدبر کے ساتھ گرا دیا۔اور ظاہر ہے نجم الدین اربکان کی جماعت سے ان کی علیحدگی کو اسی نظر سے دیکھا جا رہا تھا کہ یہ لوگ درحقیقت ماڈرن سیاست پر یقین رکھنے والے لوگ ہیں۔جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی میں ہر رنگ اور نسل کے لوگوں کو ذمہ داریاں دی گئیں۔نظریات کے تفاوت کو برداشت کر کے لوگوں کو جماعت میں شامل کیا گیا۔بس ایک معیار رکھا، کہ قیادت اوپر سے نیچے تک ایماندار، دیانت دار اور عوامی خدمت کا جذبہ رکھنے والی ہو۔طیب اردوان خود تو انتخابی سیاست میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، مگر اپنے ممولوں کو شہبازوں سے لڑانے کے لیے انتخابی مہم میں اتار دیا۔سیکولر قوتوں کا خیال یہ تھا صرف ایک برس کی نوزائیدہ جماعت انتخابات میں کیا گل کھلائے گی۔مگر 2002 کے انتخابات میں جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی اتری تو دو تہائی اکثریت حاصل کر کے ہر طرف حیرانگیاں پھیلا دیں۔ترکی فوج سکتے میں آ گئی۔ریموٹ کنٹرول عدل گاہیں لرز گئیں۔فوج کے پروردہ سیکولر راہنماؤں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔دو تہائی اکثریت کے ساتھ ملنے والی کامیابی نے طیب اردوان کی سوچ کو درست ثابت کر دیا۔بہتر سوچ کے بہتر نتائج کے ساتھ شروع ہونے والا یہ سفر پھر کوئی روک نہیں سکا۔ 2004 کے بلدیاتی انتخابات میں بھی جسٹس پارٹی نے جھاڑو پھیر دی۔معاشی انقلاب کے نتیجے میں 2007 کے عام انتخابات میں جسٹس پارٹی نے ایک بار پھر بھاری اکثریت حاصل کر لی۔معاشی انقلاب کو تسلسل دیا۔ترکی نے اپنی تاریخ کی تیز رفتار ترقی کو انجوائے کرنا شروع کیا۔اسی لیے 2009 کے بلدیاتی انتخابات میں بھی جسٹس پارٹی نے ایک بار پھر مخالفین کو دھو دیا۔ایک مضبوط ٹریک ریکارڈ کے ساتھ جسٹس پارٹی 2011 کے

عام انتخابات میں گئی اور ایک بار پھر دو تہائی اکثریت کے ساتھ ایوان نمائندگان میں پہنچ گئی۔

جسٹس پارٹی کی مستقل کامیابیوں کے بعد اب سیکولر قوتوں نے استنبول میں ایک طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہے۔ ایک پارک کو ایشو بنا کر وہ طیب اردوان سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کیا واقعی یہ معاملہ اتنا سادہ ہے کہ صرف ایک پارک کی بنیاد پر ایک ایسے شخص سے استعفے کا مطالبہ کیا جائے جو ترکی میں تفریحی مقامات کا معمار ہے؟ کیا واقعی یہ اتنی سی ہی بات ہے؟ نہیں یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ طیب اردوان نے مومنانہ فراست کے ذریعے ترکی کو ایک بار پھر مسلم دنیا کا مرکز بنا دیا ہے۔ وہ فوج جو ہمیشہ سیکولر آئین کے تحفظ کے لیے جمہوری حکومتوں کے تخت الٹتی تھی اس کو اردوان نے لگام ڈال دی ہے۔ منہ زور عدالتوں کا غیر آئینی زور اس نے زیر و کر دیا ہے۔ اتاترک ازم شدت پسند غبارے سے اس نے ہوا نکال دی ہے۔ اب سیکولرز کے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ ماتم کریں۔ گریہ کریں۔ نوحے اور مرثیے پڑھیں۔ تقسیم سکوائر پر سینہ کوبی کریں۔۔ اس سے زیادہ کچھ کر نہیں کر سکتے کہ جسٹس پارٹی کو 62 فیصد عوام کی حمایت حاصل ہے۔ عدل اور انصاف، معاشی ترقی، اور تعلیمی انقلاب وہ چیزیں ہیں جو سیکولرز کے ہتھکنڈوں کے آگے ایک بڑی دیوار بنی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ گیارہ برسوں میں اردوان نے یہ دیوار کس طرح تعمیر کی؟ ترک عوام کا اعتماد کیسے حاصل کیا؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

عام انتخابات میں گئی اور ایک بار پھر دو تہائی اکثریت کے ساتھ ایوان نمائندگان میں پہنچ گئی۔

جسٹس پارٹی کی مستقل کامیابیوں کے بعد اب سیکولر قوتوں نے استنبول میں ایک طوفان بدتمیزی اٹھا رکھا ہے۔ ایک پارک کو ایشو بنا کر وہ طیب اردوان سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ کیا واقعی یہ معاملہ اتنا سادہ ہے کہ صرف ایک پارک کی بنیاد پر ایک ایسے شخص سے استعفے کا مطالبہ کیا جائے جو ترکی میں تاریخی مقامات کا معمار ہے؟ کیا واقعی یہ اتنی سی ہی بات ہے؟ نہیں یہ اتنی سادہ بات نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ طیب اردوان نے مومنانہ فراست کے ذریعے ترکی کو ایک بار پھر مسلم دنیا کا مرکز بنا دیا ہے۔ وہ فوج جو ہمیشہ سیکولر آئین کے تحفظ کے لیے جمہوری حکومتوں کے تختے الٹتی تھی اس کو اردوان نے لگام ڈال دی ہے۔ منہ زور عدالتوں کا غیر آئینی زور اس نے زیر کر دیا ہے۔ اتاترک ازم شدت پسند غبارے سے اس نے ہوا نکال دی ہے۔ اب سیکولرز کے پاس ایک ہی راستہ ہے۔ ماتم کریں۔ گریہ کریں۔ نوحے اور مرثیے پڑھیں۔ تقسیم سکوائر پر سینہ کوبی کریں۔ اس سے زیادہ کچھ کر نہیں کر سکتے کہ جسٹس پارٹی کو 62 فیصد عوام کی حمایت حاصل ہے۔ عدل اور انصاف، معاشی ترقی، اور تعلیمی انقلاب وہ چیزیں ہیں جو سیکولرز کے ہتھکنڈوں کے آگے ایک بڑی دیوار بنی ہوئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ گیارہ برسوں میں اردوان نے یہ دیوار کس طرح تعمیر کی؟ ترک عوام کا اعتماد کیسے حاصل کیا؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

ترکی کا مردِ آہن اور یورپ کا مردِ بیمار!

طیب اردوان نے طے کیا کہ وہ راستے میں حائل ہر رکاوٹ کو توڑ کر اپنی منزل کی طرف جائیں گے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ مذہب کے نام کو سرد خانے میں ڈال کر ترکی کو اس مقام پر لے جانا چاہیے جس کا تصور محال بنا دیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے نجم الدین اربکان سے الگ ہو کر طیب اردوان نے اپنی سیاسی جماعت جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ ہم یہاں جو آج بیٹھ کر طیب اردوان کے نام کی تسبیح پڑھتے ہیں، اس اردوان کو پاسبانِ حرم کے جو طعنے سننے پڑے وہ ایک مستقل تاریخ ہے۔ وہ سیکولر ہو گیا ہے، وہ ملحد ہو چکا، وہ مغربی نظام سے متاثر ہو چکا ہے، وہ بک چکا ہے، وہ اسلام پسندوں کے مقابلے میں آ گیا ہے، وہ ایک سازش کے تحت نجم الدین اربکان کے ووٹ توڑ رہا ہے...... مگر کامیاب ل قافلے وہی ٹھہرے ہیں جو گرد و پیش کی آوازوں پر کان دھرے بغیر یکسوئی سے اپنا سفر جاری رکھیں۔ طیب اردوان اپنی سوچ کے ساتھ 2002 کے انتخابات میں اترے اور دو تہائی اکثریت کے ساتھ ایوان میں پہنچ گئے۔ اس پہلی مدت میں مذہب کا کوئی ذکر نہیں ہوا۔ امن خوش حالی اور انصاف کا بلند معیار قائم کیا گیا۔ اسی کل اثاثہ خدمت کے ساتھ 2007 کے انتخابات میں اترے اور دوبارہ بھاری اکثریت کے ساتھ ایوان میں پہنچ گئے۔ اب بھی مذہب اور نظریات کا رنگ نہیں ڈالا گیا۔ وہی امن خوش حالی اور انصاف کو بنیاد بنایا گیا۔ اس دوسری ٹرم میں ترکی نے جو خوش حالی دیکھی وہ ستر برسوں کی مجموعی خوش حالی سے دگنی تھی۔ اسی کامیابی کے ساتھ وہ 2011 کے انتخابات میں گئے اور عوام کے اسی اعتماد کے سہارے واپس ایوان میں لوٹے۔ اس کے بعد کا ترکی یہ رہا آپ کے سامنے۔

جسٹس پارٹی کا عہد اقتدار مجموعی طور پر گیارہ برسوں پر محیط ہے۔ ہر مدت کا الگ سے جائزہ لینا مشکل ہوگا، ہم مجموعی کارکردگی کا جائزہ پیش کیے دیتے ہیں۔ ایک عوامی جلسے میں اسلامی نظم پڑھنے کی وجہ سے طیب اردوان پر انتخابی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی

تھی۔2002 کے انتخابات میں وہ حصہ نہیں لے سکے۔جسٹس پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو عبداللہ گل وزیراعظم منتخب ہوئے۔پہلے ہی سال عبداللہ گل نے ریپبلکن پیپلز پارٹی کے تعاون سے آئین میں ایک ترمیم کے ذریعے طیب اردگان پر سے پابندی اٹھوادی۔2003 میں استنبول میں اردوان کے حلقے سے ضمنی انتخابات کا اعلان کردیا گیا۔طیب اردوان ایوان میں پہنچے اور عبداللہ گل نے وزارت عظمیٰ کے منصب سے دستبردار ہونے کا اعلان کردیا۔ترکی کے مرد آہن طیب اردوان نے وزارت اعظمیٰ کا منصب سنبھالا اور یورپ کے مرد بیمار کی دوا کرنے لگے۔ترکی کو یورپ کا مرد بیمار کیوں کہا گیا؟ کیونکہ یورپ آج سے صرف بارہ برس پہلے تک معاشی زبوں حالی کا شکار تھا۔بڑھتی ہوئی مہنگائی نے شہریوں کا جینا دوبھر کیا ہوا تھا۔فوج سے لے کر پولیس تک ہرادارے کے درو بام پر کرپشن کا شیش ناگ پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ٹیکس چوری کی وبا نے ترکی کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔مارکیٹ کی رگوں میں ملاوٹ کا ناسور دوڑ رہا تھا۔شہریوں کی سہولیات اور ان کے حقوق تقریباً معطل ہو چکے تھے۔ترکی کی کمر آئی ایم ایف کے انیس قرضوں کے بوجھ نے دہری کردی تھی۔یورپ کے اس مرد بیمار کا علاج طیب اردوان کے ایسے کیمیا گر کے پاس ہی تھا۔اس کا علاج خلوص محنت ایمانداری عدل وانصاف اور حب الوطنی ایسے نسخوں میں پوشیدہ تھا۔طیب اردوان نے پہلے مرحلے میں منہ زور سرکاری اخراجات کو لگام ڈالی۔وزرا کو سادگی کی مثال قائم کرنے پر آمادہ کیا۔ٹیکس چوری کی وبا روکنے کے لیے اردوان نے اشرافیہ پر ٹیکس کے قوانین سختی سے لاگو کیے۔اضافی اخراجات کنٹرول ہوتے ہی جسٹس پارٹی کے چارہ سازوں نے کرپشن پر ہاتھ ڈالا۔صرف دو سال کے عرصے میں ترکی کے جسم سے کرپشن کا ناسور الگ کر کے پھینک دیا گیا۔کرپشن کے صرف مردہ جراثیم رہ گئے تھے جس کا صفایا بقیہ گیارہ سالوں میں کردیا گیا۔مرد بیمار بستر سے اٹھ کر چہل قدمی کے قابل ہوگیا۔صرف چار سالوں میں خسارے کا بجٹ منافع کے بجٹ میں بدل گیا۔اردوان نے اپنے وزیرخزانہ علی بابکان کو طلب کر کے کہا، کہ غیرملکی سرمایہ کاری کو توجہ ترکی کی مارکیٹ کی طرف کھینچنے کے لیے جس حد تک بھی پالیسی کو پرکشش بنایا جا سکے، بنایا جائے۔علی بابکان کی محنت سے یورپ کے کا بڑا سرمایہ بہت تیزی کے ساتھ ترکی میں داخل ہونا شروع ہوا۔مرد آہن کا یہی انجکشن تھا جس نے مرد بیمار کے رگ وپے میں بجلی چھوڑ دی

۔عالمی منڈیوں میں ترکی چہل پہل کرنے لگا۔ترکی تیزی سے روبصحت ہوا مگر قرضوں کے بوجھ نے اسے گردن توڑ بخار میں مبتلا کیے رکھا تھا۔سوار دوان نے آئی ایم ایف کو قرضوں کی پہلی قسط ادا کی تو ترکی کا بخار کنٹرول میں آ گیا۔اسے امید ہو چلی کہ "ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا۔مہنگائی جو ترکی کے لیے آدھے سر کا درد بنی ہوئی تھی اس کا بھی زور ٹوٹنا شروع ہوا۔اشیا کے نرخ کم ہونے لگ گئے۔وہ وقت آیا کہ خالی جیب گھومنے والا مرد بیمار خیرات بانٹنے لگا۔ترکی میں فی کس آمدنی دوگنی سے بھی تجاوز کر گئی۔اردوان کے تیسرے دور کے آغاز میں ترکی نے 134.6 ارب ڈالر کی مصنوعات برامد کر کے عالمی منڈی میں حیرت کی ایک لہر دوڑا دی۔اسی کے ساتھ اردوان نے قرضوں کی آخری قسط بھی آئی ایم ایف کے منہ پر مار کر مرد بیمار کو عالمی معیشت کے اکھاڑے میں ایک معاشی پہلوان کے طور پر اتار دیا۔ساڑھے سات کروڑ کی آبادی والا ترکی اب دنیا کی پندھرویں بڑی معاشی قوت بن کر ابھرا۔اس وقت ترکی دنیا کے ان دس بڑے ممالک میں شامل ہے جس کی ترقی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔اور اب؟ وہ مرد بیمار جو کبھی ادھار کی پیا کرتا تھا اب پیر مغاں اسی کی چوکھٹ پر سوالی بن کر کھڑے ہیں۔جسے کل تک مرد بیمار کہا جا رہا تھا آج وہی ترکی بین الاقوامی سنیاسیوں کو طاقت کے نسخہ اکسیر بتا رہا ہے۔جی ہاں! آج آئی ایم ایف جیسا ادارہ ترکی سے پانچ ارب ڈالر کا قرضہ لینے پر غور کر رہا ہے۔

دنیا کا کوئی بھی انقلاب یا تبدیلی تعلیمی انقلاب کے بغیر دیرپا ثابت نہیں ہو سکتی۔اس حقیقت کو اخبار اور شربت بیچ کر تعلیم حاصل کرنے والے اردوان سے بہتر کون سمجھ سکتا تھا۔مرد بیمار بستر سے تو اٹھ گیا مگر اس کی تعلیم ایک بڑا سوالیہ نشان تھی۔اب ذرا آنکھیں کھولیے۔طیب اردوان نے جب ترکی کا اقتدار سنبھالا تو تعلیمی بجٹ 7.5 بلین تھا۔اردوان نے یہ بجٹ بڑھا کر 34 بلین کر دیا۔پاکستان کی طرح ترکی میں بھی سب سے زیادہ بجٹ دفاعی اداروں کے پاس ہی جاتا تھا۔اردوان نے دفاعی بجٹ میں کٹوتی کر کے تعلیمی بجٹ کو بڑھا دیا۔2003 میں طیب اردوان نے یونائیٹڈ نیشن چلڈرن فنڈ (UNICEF) کے تعاون سے Come on Girls Let's Go To School (آؤ بچیوں! چلو سکول چلیں) کے عنوان سے ایک مہم چلائی۔اس مہم کا مقصد یہ تھا کہ ترکی میں نسلی اور صنفی امتیاز کے بغیر تعلیم کو فروغ دیا

جائے۔ 2004 میں ترکی میں کورس (نصابی کتب) مکمل فری کر دیا گیا۔ 2006 تک ترکی بھر میں ایسا کوئی صوبہ نہیں تھا جو یونیورسٹی کے معاملے میں خودمختار نہ ہو۔ اردوان کے دور تک ترکی میں جتنی یونیورسٹیاں تھیں اس کا موازنہ اگر جمہوریہ ترکی کی مجموعی یورسٹیوں سے کیا جائے تو یہ ڈبل تعداد بنتی ہے۔ اس تعلیمی انقلاب نے ترک شہریوں کے دلوں پر لگے اس آخری تالے کو بھی توڑ دیا جو مذہب پسند اور لبرل عوام کے بیچ حائل تھا۔ اب ترکی نے طیب اردگان کو اپنی دھڑکنوں میں بسا لیا ہے۔

اردوان کے معاشی نسخے کی بدولت یورپ کا مرد بیمار اٹھا اور اسکول پہنچ گیا۔ اب ترکی کی مانگ میں سندھور بھرنے کا وقت تھا۔ اس کا تجربہ استنبول کو سولہ سنگھاری دلہن بنانے والے سابق میئر اردوان سے زیادہ کس کو ہوسکتا تھا۔ ترکی کے گزشتہ دس برسوں میں ترقیاتی کاموں کا جائزہ لیا جائے تو حیرانگیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ اردوان برسر اقتدار آیا تو ترکی میں ٹوٹل 26 ایئرپورٹ تھے اور آج ترکی میں 150 ایئرپورٹ ہیں۔ یوں کہا جائے کہ 90 برسوں میں جہاں 26 ایئرپورٹ تعمیر ہوئے وہاں صرف دس برسوں میں 124 ایئرپورٹ تعمیر کیے گئے۔ محنت اور ترقی کی رفتار دیکھنے لائق ہے۔ اسی طرح جمہوریہ ترکی کے قیام 1923 سے لے کر 2003 تک ترکی میں 6 ہزار کلومیٹر پر مشتمل ایکسپریس وے تعمیر ہوئی اور اردوان کے دور حکومت میں 2003 سے لیکر 2011 تک 13 ہزار 5 سو کلومیٹر پر مشتمل ایکسپریس وے تعمیر ہوئی۔ عالمی اداروں کی رپورٹوں کے مطابق ایکسپریس وے کی اس تعمیر کے بعد روڈ حادثات میں ساٹھ فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے۔ ترکی کی تاریخ میں پہلی بار تیز رفتار ریلوے لائنیں بچھائی گئیں۔ 2008 میں پہلی مرتبہ بلٹ ٹرین کی سروس شروع کی گئی۔ آبنائے باسفورس میں سمندر کی تہہ میں جا کر ایک ریلوے ٹنل کی تعمیر کا آغاز بھی کر دیا گیا ہے۔ تعمیر کے بعد یہ زیر سمندر دنیا کا سب سے گہرا ترین ریلوے ٹنل ہوگا۔ یورپ کے مرد بیمار کو اب جا کر کوئی دیکھے۔ سیاحوں کی نظریں اب اس رخ زیبا پر پڑتی ہیں تو ہٹتی نہیں ہیں۔

اردوان نے تمام تر سیاسی اور معاشی زنجیروں کو توڑ کر ترکی کو ایک آزاد خوددار و خودمختار ریاست بنا دیا۔ ترکی نے اپنے سر پر لٹکی ہوئی مغربی بلاگ کی تلوار بھی توڑ ڈالی ہے۔ عالمی مالیاتی اداروں کی بلیک میلنگ بھی فیل ہوگئی ہے۔ اردوان کو اسی دن کی تلاش تھی کہ یورپ کا مرد

بیمار بستر سے اٹھے اور عالمی مولاجٹ کے سامنے پورے اعتماد کے ساتھ کھڑا ہو۔ اسرائیل مگر اب بھی غلط فہمی کی بکل مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسی غلط فہمی میں 2008 میں اسرائیل نے غزہ کی پٹی پر جارحیت کا مظاہرہ کیا۔ اردوان نے فوری کمیٹی تشکیل دی اور بھرپور انداز میں احتجاج ریکارڈ کروا کر اسرائیل کی طبیعت ہری کر دی۔ ترکی نے اسرائیل کو دو ٹوک الفاظ میں اقتصادی بائیکاٹ کی دھمکی دی۔ اسی سال ڈیوس عالمی اقتصادی فورم میں اردوان نے دلائل کے ساتھ اسرائیل کی انگل پچ کو چیلنج کیا۔ فورم میں خطاب کے دوران اردوان کا مائیک بند کر دیا گیا۔ بات کاٹنے پر اردوان نے اجلاس کا بائیکاٹ کیا اور پہلی فلائٹ سے ترکی لوٹ گئے۔ پھر 2010 میں ترکی سے غزہ کے محصورین کے لیے امدادی سامان لے جانے والے "فریڈم فلوٹیلا" پر اسرائیلی فوج نے حملہ کر دیا۔ حملے میں 9 ترک شہری شہید ہوئے۔ اس واقعے کے فوراً بعد اردوان نے اسرائیل کو اوقات دکھا دی۔ ترکی نے اقتصادی بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔ اسرائیل کی مصنوعات پر پابندی عائد کر دی۔ تمام شعبوں میں جاری تعاون ختم کرنے کے اعلان کر دیا۔ اردوان نے اپنے نو شہیدوں کا خود استقبال کیا اور جنازوں میں شرکت کی۔ اردوان نے اعلان کیا کہ اس جارحیت پر اسرائیل کو ترکی سے باضابطہ معافی مانگنی ہوگی بصورت دیگر حالات جوں کے توں رہیں گے۔ کچھ عرصے کی آئیں بائیں شائیں کے بعد اسرائیل کی اکڑفوں نکل گئی اور ترکی کے آگے گھٹنے ٹیک دیے۔ اسرائیل نے باضابطہ معافی مانگ لی مگر اردوان نے یہ معافی بھی اس وقت تک قبول نہیں کی جب تک حماس کے اسماعیل ہانیہ خالد مشعل اور مصر کے صدر محمد مرسی کو اعتماد نہیں لے لیا۔

اس پوری صورت حال نے اردوان کو عالم اسلام کا سب سے قد آور راہنما بنا دیا۔ آزاد عرب میڈیا نے اردگان کو "قائد منتظر" کا خطاب دیا۔ دوسری جانب مطلوبہ قوت کے حصول کے بعد اردوان نے اتاترک ازم پر ہاتھ ڈال دیا۔ باقاعدہ اصلاحات کے لیے انہوں نے زمین ہموار کر دی۔ یہاں سے سیکولر قوتوں کے کان کھڑے ہوئے۔ عالمی قوتیں ترکی کی داخلی قوتوں کی پشتبان بن گئیں۔ جس کے نتیجے میں آج ترکی میں ایک سیاسی بدمزگی پیدا ہوئی۔ وہ بدمزگی جو بحران کے طور پر ہمیں دکھائی جا رہی ہے۔ عالمی قوتوں اور ترکی کی داخلہ قوتوں کا یہ غیر اعلانیہ گٹھ جوڑ کس بنیاد پر تشکیل پایا؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

طیب اردگان اور ترکی کا حالیہ سیاسی بحران!

ترکی کے وزیر اعظم طیب رجب اردوان حقیقی سوچ کا ایک وژنری انسان ہے۔ انتقام پر نہیں، وہ انتقام پر یقین رکھنے والا لیڈر ہے۔ خون نہیں ان کے سر پر جنون سوار ہے۔ یہ وہ جنون نہیں ہے جو ہمارے ہاں اکثر شعور کے ساتھ حالت جنگ میں رہتا ہے۔ اسی لیے اردوان نے تشدد جیسا آسان راستہ اختیار کرنے کے بجائے خاموشیوں کے جنگل سے گزرنے کا مشکل فیصلہ کیا۔ شاہراہوں پر ادھم مچانے کے بجائے انہوں نے کچھوے کی چال اختیار کی۔ عوام کا ساتھ لیا اور اپنی راہ پر چل دیے۔ سیکولر آئین میں ترمیم کی بات کرنا تو ایک جرم ہی تھا مگر یہ جرم بہر طور کرنا بھی تھا۔ اس ایک "جرم" کے رندانہ ارتکاب کے لیے لازمی تھا کہ اردوان پہلے دو بڑے "جرائم" پوری کامیابی کے ساتھ کرے۔ اس میں سے ایک جرم قومی سطح کا تھا اور دوسرا بین الاقوامی سطح کا۔ بین الاقوامی سطح کا جرم یہ تھا کہ اردوان ترکی کو عالمی مالیاتی اداروں کی غلامی سے نکال کر ترقی یافتہ ممالک کی صف میں لا کھڑا کرے۔ اور قومی سطح کا جرم یہ کہ ترک سیکولر فوج اور ریموٹ کنٹرول عدالتوں کا سیاسی کردار ختم کر کے انہیں اپنی حدود بتا دی جائیں۔ ان دو "جرائم" کے بعد سیکولر آئین پر ہاتھ ڈالنے کا جرم زیادہ مشکل نہیں تھا۔

بین الاقوامی سطح پر اپنے "جرم" کے ارتکاب میں اردوان کامیاب رہا۔ داخلی طور پر اردوان نے اضافی اخراجات پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ ریاستی اداروں سے کرپشن کا بھی خاتمہ کر دیا تھا۔ دوسری طرف اردوان نے ترکی کے دروازے غیر ملکی سرمایہ کاروں پر کھول دیے تھے۔ خسارے کا بجٹ بھی منافع میں بدل رہا تھا۔ فی کس آمدنی دوگنی سے بھی تجاوز کر رہی تھی۔ گرد و پیش کی دنیا بے خبر تھی اور کچھوے کی چال چلنے والا یورپ کا مرد بیمار منزل کے پاس کھڑا تھا۔ اس وقت عالمی مالیاتی اداروں میں بھونچال پیدا ہوا جب طیب اردوان سے پہلا ناقابل معافی "جرم" دانستہ سرزد ہو گیا۔ اردوان نے آئی ایم ایف کا 23 ارب ڈالر کا قرضہ لوٹا دیا۔ استعمار کی خواہش یہ رہتی

ہے کہ لکیر کے اس پار رہنے والے اس کے پس خوردہ پر گزر اوقات کیا کریں۔ اسی لیے مردِ بیمار کا اپنا قرضہ چکا دینا سامراجی قوتوں کے لیے پہلا چیلنج ثابت ہوا۔ صرف یہیں پر بس نہیں ہوا قرضوں کے گرداب سے نکلتے ہی ترکی اپنے اثاثے لپیٹ کر یورپ کی منڈی سے بھی نکلنے لگا۔ اردوان نے مغرب سے کنارہ کیا اور مشرق کا رخ کر لیا۔ ترکی نے یورپی یونین کی رکنیت کو بھی جوتے کی نوک پر رکھ دیا۔ اب حالات یہ ہیں کہ ترکی اور یورپ کے مابین تجارت کی شرح نصف سے بھی نیچے آ گئی ہے، جبکہ ترکی نے مشرق وسطی اور جنوبی افریقہ میں جو سرمایہ کاری کی ہے اس میں چار سو فیصد کا اضافہ ریکارڈ کیا گیا ہے۔ ترکی یورپی یونین کی رکنیت کا محتاج بھی نہیں رہا۔ ترک وزیر برائے یورپی امور نے حال ہی میں یہ بھی کہہ ڈالا کہ اب ہمیں یورپی یونین کی نہیں بلکہ یورپی یونین کو ہماری ضرورت ہوگی۔ حالات نے ترکی کے اس دعوے کو سچ ثابت کر دیا کہ آئی ایم ایف جیسا ادارہ ترکی سے پانچ ارب ڈالر کا قرضہ لینے پر غور کر رہا ہے۔ ترکی اس وقت 125 ارب ڈالر کے خزانے کا مالک ہے۔ اس معاشی استحکام اور نظریاتی اساس نے مل کر ترکی کو مسلم دنیا کا مرکز بنا دیا۔ اردوان نے اسرائیل کو اس کی گردن سے دبوچ کر اپنی اوقات میں لا کھڑا کیا۔ فلسطین کی مزاحمتی تحریک حماس کی قیادت کو انہوں نے اعلانیہ اپنی حمایت کا یقین دلایا۔ عرب دنیا میں ڈکٹیٹروں کے بجائے انہوں نے عوامی قوتوں کی حمایت کی۔ آج بھی وہ شام میں بشارالاسد کے مظالم کا شکار ہونے والے عوام کے شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔ اردوان نے ہی دو لاکھ شامی مہاجرین کو ترکی میں پناہ دے رکھی ہے۔ میانمار میں جب مسلمانوں پر ظلم ہوا تو پورے عالم اسلام کو سانپ سونگھا ہوا تھا۔ عرب بادشاہوں کے حلق عرب کے صحراؤں سے زیادہ خشک ہوئے پڑے تھے۔ واحد ایک اردوان تھا جس نے ترکی وزیر خارجہ کو اپنی اہلیہ کے ہمراہ میانمار کے مسلمانوں کی اشکشوئی کے لیے بھیجا تھا۔ غزہ کے محصورین کے لیے فریڈم فلوٹیلا بھی اردوان نے ہی روانہ کیا تھا جو اسرائیلی بربریت کا شکار ہوا۔ نو ترک شہری شہید ہوئے مگر اسرائیل کو نہ صرف یہ کہ اردوان کے آگے گھٹنے ٹیکنے پڑے بلکہ شہدا کی دیت بھی ادا کرنی پڑی۔

معاشی ترقی کی رفتار میں ترکی کو دنیا کے دس بڑے ممالک کی صف میں لا کھڑا کرنے کے بعد اردوان نے ترکی کے دل میں محبت کا ایک جہاں تعمیر کر ڈالا۔ عوام کے بھرپور اعتماد کے ساتھ

اردوان نے قومی سطح کے "جرائم" کے لیے تسے کس دیے۔اردوان نے آئین کی ایک ترمیم کے ذریعہ ججوں کی تقرریوں کی کا اختیار حکومتی پارٹی کو منتقل کر دیا۔ترکی میں ججوں کی تقرری فوج کی آشیرباد کے بغیر ناممکن تھی۔اردوان کی حکومت نے ترک عدل گاہوں کے قلمدان آزاد اور غیر جانبدار ججوں کے حوالے کر دیے۔سیکولر قوتیں اردوان کے اس عمل کو جبر سے تعبیر کرتی ہیں مگر کثرت رائے کے ساتھ ہونے والی کسی بھی آئینی ترمیم کو غیر آئینی عمل یا جبر کیسے کہا جا سکتا ہے۔ویسے بھی 1945 کے انتخابات میں فوج کی مدد سے دھاندلی کا عالمی ریکارڈ قائم کرنے والی ریپبلکن پیپلز پارٹی اردوان کو جمہوریت کا درس کس منہ سے دے سکتی ہے۔یہ بے چینی اور اضطراب صرف اس لیے تھا کہ ربڑ اسٹیپ عدالتوں کے ختم ہوتے ہی ان سابقہ وموجودہ فوجی جرنیلوں پر مقدمات چلائے گئے جنہوں نے گزشتہ ادوار میں جمہوری حکومتوں کا تختہ الٹنے میں کردار ادا کیا تھا۔اردوان کی دوسری حکومتی مدت میں عدالت نے بارہ فوجی جرنیلوں کو سزائے موت سنا کر ترکی کی سیاسی تاریخ ہی الٹ کر رکھ دی۔آج بھی وہ جرنیل سلاخوں کے پیچھے پڑے ہیں جنہوں نے عدنان میندریس اور نجم الدین اربکان کی منتخب حکومت کو چلتا کیا۔فوج کی مکمل مداخلت سے چلنے والے ملک ترکی میں بارہ جرنیلوں کی سزائے موت جمہوریہ ترکی کی نوے سالہ تاریخ کا سب سے بڑا واقعہ تھا۔صرف یہی نہیں،بلکہ اردوان حکومت نے سب سے زیادہ بجٹ ڈکارنے والے وفاقی اداروں کے بجٹ میں کٹوتی کر کے اضافی بال و پر بھی کاٹ دیے۔یہی اردوان کا وہ قابل ستائش جرم تھا جس کے بعد ترکی کی سیاست میں فوج اور عدلیہ کے مجرمانہ کردار کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔اب فوج صرف تحفظ فراہم کرتی ہے اور عدالتیں انصاف مہیا کرتی ہیں۔

طیب اردوان نے اپنی پہلی حکومتی مدت میں مذہب کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا،سیکولر آئین میں کسی ترمیم کا اشارہ تک بھی نہیں دیا تھا،بلکہ ساری توجہ صرف ملک کی تعمیر و ترقی پر مرکوز کیے رکھی۔البتہ اپنے عمل سے اردوان اور عبداللہ گل نے واضح رکھا کہ ہم کس قبیل کے لوگ ہیں۔طیب اردوان اور عبداللہ گل کہیں بھی جاتے اپنی بیگمات کو ساتھ رکھتے۔ان کا جسم مکمل ڈھکا ہوتا اور حجاب لیا ہوتا۔سیکولر قوتوں نے ملک بھر میں اور خاص طور سے ایوان میں بھرپور احتجاج کرتے ہوئے

اسے غیر آئینی عمل قرار دیا۔ اس پر آئین میں اس وقت تک کوئی ترمیم تو نہیں ہو سکی تھی مگر اردوان اور عبداللہ گل کے مدلل موقف نے حریفوں کو پسپا کیا ہوا تھا۔ عبداللہ گل نے ایک انٹرویو میں کہا کہ "اگر ایک عورت کو اپنی ذاتی اختیار کی بنیاد پر حجاب اتارنے کی اجازت دی جا سکتی ہے تو اسی عورت کو اسی ذاتی اختیار کی بنیاد پر حجاب لینے کی اجازت کیوں نہیں دی جا سکتی"۔ اسی طرح وہ اردوان جس پر کبھی ریاست نے صرف ایک اسلامی نظم پڑھ دینے کی وجہ سے سیاسی بندشیں عائد کر دی تھیں، وہی اردوان اب مساجد اور محافل میں خود تلاوت کرتا نظر آنے لگا۔ سیکولرز پر ترکی کی زمین تنگ نہیں کی گئی مگر مذہب پسند کسی بھی آئینی ترمیم سے پہلے ہی ایک آزاد ماحول میں سانس لینے لگے۔ شراب خانوں کو سیل نہیں کیا گیا مگر استنبول اور دیگر شہروں کے معروف شراب خانوں کے ساتھ مساجد بھی تعمیر کی گئیں۔ چار برس اسی طرح گزرے۔ بھرپور عوامی مینڈیٹ کے ساتھ اردوان 2007 کے انتخابات میں سرخرو ہوا اور دوبارہ ایوان میں پہنچا۔ اب کی بار بھی مذہب کے بجائے انسانوں کا معیار زندگی بلند کرنے پر توجہ مرکوز رکھی۔ البتہ مذہب کی غیر اعلانیہ آزادی کو تسلسل فراہم کیا۔ ترک حکومت نے اس دوران قومی سطح پر قرآن ڈے بھی منایا۔ مذہب کی آزادی سے زیادہ مگر اردوان کو قومی آزادی کی فکر لاحق تھی۔ وہ آزادی جو عالمی مالیاتی اداروں میں گروی رکھی ہوئی تھی۔ قومی آزادی کے بغیر مذہب کی آزادی اس سجدے جیسی ہی ہوتی ہے جس کی اجازت ملا کو ہند میں دی گئی تھی۔ سوان چار برسوں میں اردوان نے اسی قومی و معاشی آزادی کی جدوجہد کی۔ کامیابی کے متعدد ریکارڈز کے ساتھ اردوان کی جسٹس پارٹی نے 2011 کا انتخابی معرکہ بھی خیرہ کن کامیابی کے ساتھ سر کر لیا۔ اس تیسری کامیابی کے بعد اردوان نے گردوپیش کا جائزہ لیا، اسے محسوس ہوا کہ ہاتھ بڑھالوں تو منزل ہاتھ آ جائے گی، زمین ہموار تھی، سو اس تیسری مدت میں پہلی مرتبہ اردگان نے کہہ ڈالا کہ "تیسری بار جسٹس پارٹی کی جیت کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ ترک عوام سول آئین کا نفاذ چاہتی ہے، جسٹس پارٹی ملک کی سیکولر قوتوں کے اعتماد میں لے کر سول آئین کی تشکیل کے لیے کردار ادا کرے گی"۔ اس بیان کے بعد گویا کہ جنگ کا طبل بج گیا، مگر اردوان کی پوزیشن ناقابل یقین حد تک مستحکم تھی۔

عالمی "جرائم" کے بعد عالمی قوتوں کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اور قومی "جرائم" کے

بعد فوج کی پروردہ سیکولر قوتوں کو دن میں تارے نظر آرہے تھے۔ عالمی قوتوں اور داخلی قوتوں کے مسائل مختلف ضرور تھے مگر دشمن ایک تھا۔ دونوں قوتوں کی تان اردوان پر آکر ٹوٹی اور یوں ایک غیر اعلانیہ اتحاد قائم ہوگیا۔ عالمی قوتیں داخلی سیکولر قوتوں کی پشتیبان بن گئیں۔ ترکی کے سیاسی تیموں کو کرائے کے باپ مل گئے اور عالمی بانجھ قوتوں کو لے پالک میسر آگئے۔ مائیکروسکوپ لگا کر وہ اردوان کی غلطیاں نوٹ کرنے لگے۔ جھولی پھیلائے وہ دعائیں مانگتے رہے کہ اردوان سے کوئی خطا سرزد ہو تو ہم طوفان کھڑا کریں۔ مگر خواہشوں کے برعکس جسٹس پارٹی کی قیادت ترکی کو تیزی سے آگے لے کر بڑھ رہی تھی۔ کوئی گناہ ہاتھ نہ لگ سکا۔ مگر ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے، اور یہ تنکا سیکولر جماعتوں کو استنبول کے گیزی پارک میں پڑا مل گیا۔ ترقیاتی منصوبوں میں رکاوٹ کی وجہ سے اردوان حکومت نے گیزی پارک کے چھ سو پودے اکھاڑنا شروع کیے تو مخالفین نے پیالی میں طوفان اٹھا دیا۔ سیکولر قوتوں کا مضحکہ خیز نکتہ نظر یہ ہے کہ چھ سو پودوں کے اکھاڑ دینے سے ماحولیات کا بحران پیدا ہو جائے گا۔ یعنی استنبول میں ماحولیات کا ایشو کھڑا کر کے اس اردوان سے استعفے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے جس نے 1995 میں ماحولیات کا تیس برس پرانا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ کمال ہے!

اسی پارک کو عالمی ذرائع ابلاغ نے مکمل طور پر ایک دوسرا رنگ دیا ہے۔ سازشی خاکے میں نمایاں رنگ نیویارک ٹائمز نے بھرا ہے۔ امریکی روزنامہ نیویارک ٹائمز نے سوشل میڈیا پر Gezi Park Fund کے عنوان سے پانچ روزہ ایک مہم چلائی۔ اس مہم کا مقصد نیویارک ٹائمز میں گیزی پارک کے تحفظ کے حوالے سے ایک اشتہار شائع کرنے کے لیے فنڈ اکٹھا کرنا تھا۔ صرف پانچ دن میں اس اشتہار کے لیے 1 لاکھ 2 ہزار ڈالر کی بھاری رقم جمع کی گئی۔ اب آپ نیویارک ٹائمز کا 7 جون کا شمارہ اٹھا کر دیکھ لیں، کہ ایک فل سائز اشتہار کے ذریعہ عالمی طاقتوں کو ترک حکومت کے خلاف کس انداز سے اکسایا جا رہا ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ نے عالمی قوتوں کو اکسانے کے لیے موقف یہ اختیار کیا ہے کہ گیزی پارک میں دراصل عثمانی دور کی ایک بیرک قائم ہے جسے اردوان ازسرِنو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس موقف کو موثر بنانے کے لیے نیویارک ٹائمز نے دانستہ "گیزی پارک" کو "غازی پارک" بنا دیا تاکہ اس پورے معاملے کو ترقیاتی منصوبے کے بجائے ایک مذہبی

ایشو ثابت کیا جا سکے۔ عالمی ذرائع ابلاغ کا یہ پروپگنڈہ اس قدر موثر ثابت ہوا کہ ہمارے ہاں کے سادہ ولان حرم بھی یہی راگ الاپنے لگ گئے۔ اردوان کی حمایت میں سوشل میڈیا پر جاری مہم کا جائزہ لیں تو نادان دوست یہی کہتے پائے جائیں گے کہ اردوان کے خلاف ہونے والے مظاہروں کی وجہ عثمانی دور کی ایک بیرک کی از سر نو تعمیر ہے۔ اور یہی مقدس روحیں عالمی ذرائع ابلاغ کی نادانستہ ہمنوائی میں گیزی پارک کو مستقل غازی پارک لکھ کر عالمی قوتوں کے موقف کو تقویت فراہم کر رہی ہیں۔ کوئی جائے اور بسم اللہ کے گنبد کے ان مکینوں کو بتائے کہ اردوان پاکستان کا کوئی قائد ابن قائد نہیں ہے جو صرف ایک بیرک کے لیے اپنی گیارہ سالہ محنت داؤ پر لگا دے گا۔ خوش قسمتی سے اردوان ایک ''گناہ گار'' انسان ہے، بے مصرف قربانیوں کو اس کا شعور قبول نہیں کرتا۔ اردوان اسی شاخ کو کیسے کاٹ سکتا ہے جس پر اس نے آشیانہ تعمیر کر رکھا ہے۔ حقیقت پھر کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ترکی حکومت نے جو ترقیاتی منصوبے شروع کیے ہیں اس میں گیزی پارک کے ساتھ واقع وہ گزرگاہ بھی شامل ہے جہاں سے لاکھوں لوگوں کے ساتھ ٹریفک کا گزر بھی ہوتا ہے۔ ٹریفک کو زیر زمین منتقل کر کے اس مقام کو پیدل چلنے والوں کے لیے مختص کرنا اس منصوبے کا بنیادی حصہ ہے۔ ساتھ ہی میں اس مقام کی اہمیت اور خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک تجارتی مرکز اور خوبصورت مسجد کی تعمیر کو منصوبے میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی منصوبے پر عمل کے لیے جب گیزی پارک کے چھ سو پودوں پر ہاتھ ڈالا گیا تو صحرائے سیاست کے پیادوں کو موقع مل گیا۔ ایک طوفان اٹھا اور قوم سے کہا گیا کہ اٹھ کھڑے ہو کہ ترکی میں ماحولیات کا بحران کھڑا ہونے والا ہے۔ گیزی پارک ایک بہانہ ہے جو داخلی سیکولر قوتوں نے ''ماحولیات'' کا عنوان دے کر تراشا ہے، اور عثمانی دور کی فوجی بیرک ایک افسانہ ہے جو عالمی ذرائع ابلاغ نے ''غازی پارک'' کا ٹائٹل دے کر تخلیق کیا ہے۔ اس بحران کا اصل سبب عالم اسلام میں ابھرتا ہوا ترکی کا وہ قائدانہ کردار ہے جس نے نظریاتی اساس اور معاشی استحکام سے جنم لیا ہے۔ نظریاتی اساس سیکولرز کے لیے دردسر۔ معاشی استحکام سامراج کے لیے چیلنج۔

تقسیم سکوائر کے نوحہ گروں کی آہ و بکا دراصل کمیلے میں دم توڑتے ہوئے جانور کی آخری

ہچکیاں ہیں۔ ہفتہ بھر میں آخری ہچکی کے بعد ڈوبتی ہوئی یہ سانسیں بھی فنا ہو جائیں گی۔ کیونکہ ترکی میں غیر جمہوری اور غیر آئینی راستے اردوان نے مسدود کر دیے ہیں۔ ساٹھ فیصد سے زیادہ عوام کی حمایت اس کو حاصل ہے۔ گزشتہ روز استنبول اور انقرہ کی سڑکوں پر لاکھوں نوجوانوں نے نکل کر تقسیم سکوائر کے دس ہزار مظاہرین کو اخلاقی جواب دے دیا ہے۔ استنبول کے سات لاکھ نوجوانوں نے اپنے راہنما سے بیک آواز ایک ہی مطالبہ کیا" قائد! آؤ چلیں تقسیم کو کچل کر رکھ دیں"۔ مگر اردوان نے سات لاکھ کے مجمع سے صرف ایک ہی بات کہی" ہم جمہوری لوگ ہیں، صبر کا دامن تھامے رکھو، تقسیم اسکوائر والوں کو مات دینی ہے تو صرف سات ماہ انتظار کرو، بلدیاتی انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے ان کو بتا دو کہ وہ زمانے لد گئے جب اتاترک کی فوج ہمیں چیلنج کیا کرتی تھی"۔ کسی اور سے نہیں، حقیقت حال اسرائیلی تجزیہ نگار سے ہی سن لیجیے، اسرائیل ٹوڈے میں شائع ہونے والی بوعز بسموت کی ایک تحریر میں بڑے ترنگ سے یہ خوش گوار خبر دی گئی ہے کہ" ترکی کھول رہا ہے"، مگر ساتھ ہی اس حقیقت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے کہ ترکی کے حالیہ سیاسی بحران کے باوجود جب ترک شہریوں کے سامنے سوال رکھا گیا کہ ووٹ کس کو دو گے؟ تو سو فیصد لوگوں کا ایک ہی جواب تھا... طیب اردوان کو!!!! ۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ اے ہنرمندان آئین و سیاست! اے خداوندان ایوان عقائد! کوئی ہے جو "عشق ممنوع" جیسے ڈراموں کے سوا بھی ترکی سے کچھ حاصل کرے؟ کوئی سبق۔ کوئی وژن۔

زبانِ یارِ من ترکی!

معاشی انقلاب، جمہوری اقدار اور تہذیبی اصلاحات کے بعد ترکی رول ماڈل بنتا جا رہا ہے۔ مسلم دنیا کے حکمرانوں پر عوامی دباؤ بڑھتا جا رہا ہے کہ ترکی کو ایک ماڈل کو طور لیا جائے۔ ترکی کے گزشتہ گیارہ برسوں کی انقلابی تبدیلی میں پاکستان کی مذہبی اور سیاسی جماعتوں کے لیے بھی سیکھنے کو بہت کچھ ہے۔ باقی دنیا کی طرح پاکستان بھی ترکی کے باقاعدہ سحر میں ہیں۔ پاکستان کی دو بڑی سیاسی جماعتیں اور مذہبی سیاسی جماعتیں جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کی مسلسل کامیابی سے بہت متاثر ہیں۔ سیاسی اور مذہبی سیاسی جماعتوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم بھی پاکستان کو ترکی بنائیں گے، مگر سیاسی جماعتوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ معاشی استحکام سے پہلے بلٹ ٹرین چلانا چاہتی ہیں، اور مذہبی جماعتوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ ترکی میں مذہب پسندوں کی کامیابی پر صرف شادیانے بجا کر ایمان کو تازہ رکھنا چاہتی ہیں۔

مذہبی سیاسی جماعتوں کی طرف آئیں گے، آج کے اس حصے میں سیاسی جماعتوں کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان مسلم لیگ اور پاکستان تحریک انصاف دو ایسی جماعتیں ہیں جو پاکستان کو ترکی بنانا چاہتی ہیں، مگر دونوں جماعتیں ترکی طرز کے انقلاب کا سفر وہاں سے شروع کرنا چاہتی ہیں جہاں جا کر یہ سفر تمام ہوتا ہے۔ طیب اردوان نے اسرائیل اور امریکہ کو آنکھیں دکھانا شروع کیں تو تحریک انصاف کی قیادت کو لگا کہ شاید آنکھیں دکھانے کے لیے صرف ڈائٹ قسم کی غیرت ہی درکار ہوتی ہے، سو تحریک انصاف کی قیادت نے بھی خالی پیٹ ڈرون مار گرانے کے دعوے شروع کر دیے۔ انہوں نے شاید یہ نہیں سوچا کہ طیب اردوان کا اسرائیل کو للکارنا ان وقتوں کی بات ہے جب ترکی کے کندھوں سے قرضوں کا بوجھ اتر گیا تھا۔ ترکی نے معاشی طور پر خود کو سامراج کی غلامی سے نکالا تو اس کی غیرت و حمیت میں تاثیر پیدا ہوئی ورنہ یہی طیب اردوان برسر اقتدار تھے اور امریکہ کو ترکی کے راستے اپنا ساز و سامان عراق لے جانے کی اجازت مل گئی

تھی۔اسی طرح طیب اردوان نے ترکی کی یونیورسٹیوں میں لیپ ٹاپ تقسیم کیے تو پنجاب حکومت کو لگا کہ شاید ترک عوام اردوان کے تعلیمی انقلاب کی اس لیے مداح ہے کہ اس نے لیپ ٹاپ تقسیم کیے تھے۔پنجاب حکومت نے دیکھا دیکھی 23 ارب روپے کے لیپ ٹاپ ریوڑیوں کی طرح بانٹ دیے۔انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ ترکی نے پہلے معاشی طور پر خود کو کھڑا کیا، پھر ترکی کے ہر صوبے میں معیاری یونیورسٹی قائم کی، فوج کے بجٹ میں کٹوتی کر کے تعلیم کا بجٹ 5 اعشاریہ 7 بلین سے بڑھا کر 34 بلین کیا، نصابی کتب پورے ملک میں فری کر دیں، لڑکیوں کی تعلیم کے لیے ماحول تشکیل دیا، جب بنیادی تعلیمی ضرورتیں مکمل کر لی گئیں اس کے بعد جا کر جب ترکی کے خزانے نے اجازت دی تو لیپ ٹاپ بانٹے گئے۔پنجاب سمیت ملک بھر کے سرکاری تعلیمی اداروں کا حال یہ ہے کہ اب بھی چودھریوں کے گدھے گھوڑے وہاں بندھے ہوئے ہیں۔نصف سے زائد کی آبادی تعلیم سے اب بھی محروم ہے۔سپریم کورٹ کی رپورٹ کے مطابق پنجاب کے تین سو سے زائد سکولوں کی حالت یہ ہے کہ اساتذہ اور اسٹوڈنٹس دونوں ہی نہیں ہیں۔اسکولوں کا احاطہ کچرا کونڈیوں کے طور پر استعمال ہو رہا ہے، پرائیوٹ ایجوکیشن کا رجحان اب بھی غالب ہے۔اس ملک میں ترکی ماڈل کے خواب دیکھنے والوں نے اول دانش سکول تعمیر کیے اور پھر 23 ارب کی لاگت سے لیپ ٹاپ تقسیم کیے۔اس پر مستزاد المیہ یہ کہ اس حکومت کے ہمدردوں نے ہاتھ روکنے کے بجائے اس کو تعلیمی انقلاب سے تعبیر کیا۔حالانکہ پنجاب حکومت کوئی ویلفیئر ادارہ نہیں تھا جو اربوں کی لاگت سے اسکولوں کی ایک نئی چین تعمیر کرے۔اس کا کام یہ تھا کہ جو سرکاری تعلیمی ادارے موجود ہیں انہی کی حالت بہتر بنانے پر غور کرے۔یہ سب ٹھیک ہونے سے پہلے لیپ ٹاپ کی تقسیم اور دانش سکولوں کی تعمیر کو غیر دانشمندانہ عمل کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔اسی طرح اردوان حکومت نے استنبول اور انقرہ میں میٹرو بس سروس شروع کی تو پنجاب حکومت کو لگا کہ شاید اردوان کی مسلسل جیت کا راز یہ ہے کہ انہوں نے عوام کو میٹرو بس سروس مہیا کی ہے۔سو پنجاب حکومت نے بھی 30 ارب کی لاگت سے میٹرو بس سروس شروع کر دی۔پنجاب حکومت نے یہاں بھی یہ نہیں سوچا کہ استنبول اور انقرہ میں بسوں کی عیاشی اس وقت آئی جب ترکی کے خزانے میں پیسہ آ گیا، پہلے ترک حکومت نے انیس ہزار کلومیٹر طویل ایکسپریس وے تعمیر کی، پورے ترکی میں

سڑکوں کا بے مثال جال بچھایا، ہیوی ٹریفک کا لوڈ شہر کی خارجی شاہراہوں پر شفٹ کیا، ٹریفک کا نظام بہتر کیا، صرف استنبول میں پچاس پل تعمیر کیے، آلودگی کے مسئلے پر قابو پایا گیا، یہ سب ہوگیا تب جا کر ترکی نے میٹرو بس سروس کا آغاز کیا۔ پنجاب سمیت ملک بھر کی صورت حال جا کر دیکھ لیں، پشاور اور کوئٹہ میں کوئی سڑک سلامت مل جائے تو غنیمت ہے، اندرون سندھ کا سٹرکچر قدیم کھنڈرات کا منظر پیش کرتا ہے، اسی طرح پورے پنجاب کی توجہ لاہور پر لگانے کے باوجود ٹریفک کا نظام اب تک ٹھیک نہیں ہو سکا ہے، اندرون پنجاب کی سڑکیں اب بھی تباہ حال ہیں، لاہور سمیت پورے پنجاب کا ٹریفک نظام درہم برہم ہے، کبھی جا کر دیکھیں پنجاب کا انفراسٹرکچر سندھ سے بہتر مگر تباہ حال ہے، جہاں سڑکیں برباد ہوں وہاں میٹرو بس کے خواب دیکھنے پر بھاری جرمانے لگنے چاہیے تھے، مگر ہم ہیں کہ ڈھول پیٹتے رہے کہ پنجاب بدل گیا اب پاکستان بدلے گا۔ ہم کس دنیا میں رہتے ہیں؟ کیا تبدیلی یہ ہوتی ہے جو ہمیں دیکھنے کو مل رہی ہے؟

اب پاکستان مسلم لیگ وفاق میں برسراقتدار ہے۔ آپ بجلی کی بات کریں یا مہنگائی کی، آپ کو ایک ہی جواب ملے گا، خزانہ خالی ہے۔ اس کا آسان سا مطلب یہی ہوا کہ ملک کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی بحران ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ خزانہ خالی کیوں ہے؟ اس کی وجوہات معلوم کرنے کے لیے البیرونی کا دماغ نہیں چاہیے، سادہ سی تین وجوہات ہیں۔ 1۔ ہماری آمدنی کم اور اخراجات زیادہ ہیں، ہم سو روپے کماتے ہیں اور ایک سو ستر روپے پھونک دیتے ہیں۔ 2۔ ہم ٹیکس نہیں دیتے، طبقہ اشرافیہ خود کو ٹیکس سے مکمل طور پر مستثنیٰ سمجھتا ہے، ان میں بھی اکثریت ان کی ہے جن کے ہاتھوں میں ملک و قوم کی تقدیر ہے۔ 3۔ ہمارے اداروں میں کرپشن قومی فریضے کی طرح ہو رہی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ملک کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے تین بنیادی اقدامات کیا ہو سکتے ہیں؟ میٹرو اور بلٹ ٹرین کے آئیڈیاز ترکی سے لینے والے اس سوال کا جواب بھی ترکی سے کیوں نہیں لے لیتے۔ طیب اردوان جب برسراقتدار آئے تو ترکی کا سب سے بڑا مسئلہ انہوں نے ڈوبتی معیشت کو ہی قرار دیا تھا۔ پاکستان کی طرح ترکی کے معاشی بحران کی بھی تین ہی وجوہات تھیں۔ 1۔ اخراجات زیادہ آمدنی کم۔ 2۔ ٹیکس چوری۔ 3۔ اور کرپشن۔ اس معاشی بحران سے نمٹنے کے لیے طیب اردوان نے تین بنیادی اقدامات کیے۔ منہ زور اخراجات پر پہلے

ہی مہینے میں کنٹرول کرلیا۔ اشرافیہ سے ٹیکس وصول کیا، ٹیکس چوری کی روک تھام کے لیے سخت قوانین نافذ کیے، ریگولر ٹیکس ادا کرنے والوں کے لیے پالیسی میں نرمی پیدا کی گئی، ٹیکس نادہندگان کے لیے پالیسی سخت کردی گئی۔ اور ایک سال کے اندر اداروں سے کرپشن کا خاتمہ کردیا گیا۔ کیا یہ کوئی راکٹ سائنس ہے جو ہمیں سمجھ نہیں آرہی؟ ہمارے ہاں سیاستدان عوام کو اعداد و شمار کے بکھیڑوں میں الجھا کر رکھ دیتے ہیں، بات کو ناگمان سے گھما کر لاتے ہیں اور مسئلے کے سادہ حل سے توجہ ہٹا دیتے ہیں۔ پاکستان کو معاشی بحران سے نکالنے کے لیے بھی اول و آخر تین اقدامات کرنے ہوں گے۔ اول یہ کہ حکومت اضافی سرکاری اخراجات کو کنٹرول کرے، اس کے لیے حقیقی سادگی کو رواج بخشا جائے، وزرا کو سیکورٹی ضرور دی جائے مگر پروٹوکول واپس لے لیا جائے، غیر ملکی دوروں میں کمی لائی جائے، صوابدیدی فنڈز پر پابندی عائد کردی جائے، سرکاری خرچ پر ہونے والے حج و عمرے پر پابندی عائد کردی جائے، اضافی عملے کا بوجھ اداروں کے کندھوں سے اتار دیا جائے۔ دوم یہ کہ حکومت ٹیکس کے نظام کو بہتر اور صاف و شفاف بنائے، سرمایہ داروں جاگیرداروں اور بڑے کاروباری طبقے کا ٹیکس میں غیر اعلانیہ استثنیٰ ختم کردیا جائے، سیاسی جماعتوں کے لیڈروں کو سب سے پہلے ٹیکس کا پابند بنایا جائے، کسی بھی قسم کی کوتاہی برداشت نہ کی جائے۔ اور سوم یہ کہ حکومت کرپشن کو کنٹرول کرے، نیب جیسے ادارے کو آزاد کردیا جائے، ترقیاتی فنڈز کی نگرانی کے لیے کمیٹی تشکیل دی جائے جو فنڈز کے اجرا پر چیک رکھے، سول سروسز کی بھرتیاں غیر سیاسی بنیادوں پر کی جائیں۔

کیا موجودہ حکومت نے ترجیحی بنیادوں پر یہ اقدامات کیے؟ جواب ہے، نہیں۔ آپ ایک طرف وزیراعلیٰ پنجاب کا یہ بیان رکھیں کہ ''ہم پنجاب میں ترکی طرز کا تھانہ سسٹم لے کر آرہے ہیں'' اور دوسری طرف آپ حکومت کا حالیہ بجٹ رکھ کر دیکھیں، آپ کو ترکی ماڈل کو فالو کرنے کے معاملے میں ہماری سیاسی قیادت کا تضاد واضح نظر آجائے گا۔ یعنی تھانہ سسٹم میں تو ہم ترکی کو فالو کریں گے، اسی طرح ہماری ٹرانسپورٹ بھی ترکی طرز کی ہوگی، ہم لیپ ٹاپ بھی ترکی کی طرح بانٹیں گے، مگر معاشی بحران سے نمٹنے کے لیے ترکی کو حبیب جالب کی طرح دور سے سلام کریں گے۔ ابھی تک اخراجات کو کنٹرول کرنے کی جو باتیں ہوئی ہیں وہ سب وہ باتوں تک ہی

محدود ہیں۔ حکومتی قیادت جس سادگی کی بات کر رہی ہے وہ صرف اتنی ہے جتنی کہ موجودہ حکومت کو گزشتہ حکومت سے مختلف ظاہر کرے، یہ وہ سادگی نہیں ہے جس کا مطالبہ اس وقت خزانہ کر رہا ہے۔ اخراجات میں کمی لانے کا مطلب یہ ہے کہ سیکورٹی برقرار رکھ کر پروٹوکول واپس لے لیا جائے، مگر یہاں پروٹوکول برقرار رکھ کر سیکورٹی میں کمی لائی جارہی ہے۔ شاہ مزاجیاں جوں کی توں ہیں اور حکومت عوام سے پیٹ پر پتھر باندھنے کی معصومانہ التجا کر رہی ہے۔ اسی طرح ٹیکس کا معاملہ دیکھ لیں، ترکی نے ٹیکس کے معاملے میں ان لوگوں کو سہولیات دیں جو باقاعدگی سے ٹیکس دیتے آئے تھے، اس طبقے کے گرد گھیرا تنگ کیا جو ٹیکس چوری کر رہے تھے۔ پوری دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ ٹیکس دہندگان کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور نادہندگان کے لیے سخت قوانین نافذ کیے جاتے ہیں۔ مگر یہاں تو بالکل ہی برعکس ہوا۔ اس ملک میں ٹیکس چوری کی لعنت بڑے کاروباری طبقے میں ہی پائی جاتی ہے، مگر اسی طبقے کے ٹیکس میں پانچ فیصد کمی کر دی گئی، وہ تنخواہ دار طبقہ جو پوری ایمانداری کے ساتھ ٹیکس دیتا رہا اس پر مزید ٹیکس کا بوجھ ڈال دیا گیا۔ ہم یہاں ٹیکس کے اضافے پر بات نہیں کرتے، ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ خالی خزانے کا تقاضہ یہ ہوگا کہ ٹیکس بڑھا دیا جائے مگر ٹیکس بڑھانے سے پہلے کیا ضروری نہیں کہ ٹیکس کے قوانین بلا امتیاز نافذ کر دیے جائیں؟ ٹیکس چوروں کے خلاف ایکشن لیا جائے؟ کیا حکومت اسمبلی میں بیٹھے ان ستر فیصد ممبران کے خلاف کاروائی کر سکتی ہے جنہوں نے گزشتہ دس برسوں میں کوئی ٹیکس نہیں دیا؟ یہی معاملہ کرپشن کا ہے، اداروں میں اب بھی سیاسی بنیادوں بھرتیاں ہو رہی ہیں، میرٹ کا سرعام خون ہو رہا ہے، عطار کے انہی لونڈوں سے دوائی جارہی ہے جن کے سبب یہ ملک بیمار ہوا، مگر ہمارا دعوی یہ ہے کہ کرپشن کا خاتمہ ہونے جارہا ہے۔ کیا اردوان حکومت کا طرز عمل یہی تھا؟ ان کا تو ژن یہ ہے سسٹم ٹھیک کیے بغیر ترقی کے خواب ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔

حکومت سے نہیں، یہ گلہ عوام سے ہے کہ انہوں نے اپنی ترجیحات اس قدر سطحی کیوں رکھی ہیں۔ ہمیں تعلیم سے پہلے لیپ ٹاپ کیوں چاہیے۔ ہم سڑک کی تعمیر سے پہلے میٹرو بس میں کیوں سوار ہونا چاہتے ہیں۔ تاریک راستوں کا سفر ہم بلٹ ٹرین میں کیوں طے کرنا چاہتے ہیں۔ گیس سے پہلے ہم میڈان کوریا چولہوں کے خواب کیوں دیکھتے ہیں۔ پٹرول سے پہلے ہائبرڈ کار کے

لشکارے کیوں مارنا چاہتے ہیں۔کمال کے لوگ ہیں،ہاتھ سلامت نہیں اور ہمیں دستانے درکار ہیں۔دھڑوں پر سلامت نہیں اور ہمیں دستار چاہیے۔ہم خالی جیب عیاشی کرنا چاہتے ہیں۔پیٹ پر پتھر باندھ کر ہم سگار کے کش لگانا چاہتے ہیں۔گھر میں بچوں کے سروں پر جہالت منڈلا رہی ہے،بیماریاں گھروں میں پڑاؤ ڈالے بیٹھی ہیں،موت اور زندگی کی ہم کشمکش میں ہیں،مگر صحت اور تعلیم کی فکر سے پہلے ہمیں زیرو میٹر کار چاہیے۔ہمیں چمک کی پڑی ہے۔کتابیں خریدنے کو پیسے نہیں،یونیفارم تار تار ہے،جوتے پھٹے ہوئے ہیں،آگے سکول اور کالج میں گدھے اور گھوڑے بندھے ہیں،ڈیسک ٹوٹے ہوئے ہیں،عمارت خستہ حال ہے،مگر گھر سے سکول تک کا سفر ہم نے میٹرو بس میں طے کرنا ہے۔واہ رے فاقہ کشوں کی یہ فاقہ مستیاں۔ہم اداروں کی بات کیوں نہیں کرتے۔ہم نظام کی بات کیوں نہیں کرتے۔ہم کیوں یہ طے کر چکے کہ یہ سسٹم ٹھیک نہیں ہو سکتا۔ہم کیوں بچوں کو یہ پٹی پڑھا رہے ہیں کہ کرپشن کا ناسور اب پاکستان کی جڑوں میں بیٹھ چکا ہے،اس کا خاتمہ ممکن نہیں ہے۔جس ترکی پر ہم واری جا رہے ہیں،یہ سب وہاں بھی ناممکن تھا،مگر طیب اردوان نے سب ممکن کر دکھایا۔کیا میٹرو کی طرح ہم اخراجات کے کنٹرول میں ترکی کی اتباع نہیں کر سکتے؟کیا لیپ ٹاپ کی طرح ہم ٹیکس کے نظام میں ترکی کو مثال نہیں بنا سکتے؟کیا تھانہ سسٹم کی طرح ہم کرپشن سے نجات کے لیے ترکی کو سامنے نہیں کھ سکتے؟کیوں نہیں۔آخر کیوں نہیں۔

ومن ترکی نمی دانم!

پاکستان کی سیاسی جماعتیں پاکستان کو ترکی بنانے کا خواب دیکھتی ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ یہ جماعتیں بس خواب ہی دیکھ رہی ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ پاکستان بھی ترکی کی طرح ایک ماڈل بن کر ابھرے۔ مگر اس خواہش سے پہلے وہ قوت عشق بھی تو درکار ہے جو ہر پست کو بالا کر دے۔ ایسی قوت درکار ہے جس کی آنکھ ایک ہو اور وہ بھی بے رحم ہو۔ ذاتی مفادات اور اقربا پروری سے اٹھ کر جو اس ملک پر نگاہ ڈالے۔ اور یہ تب ہو سکتا ہے کہ جب یہ طے کر لیا جائے اس نظام کہن کو منہ کے بل گرایا جا سکتا ہے۔ اگر طے کیا جا چکا ہو کہ یہ دیس جن پستیوں میں جا گرا ہے وہاں سے اس کو واپس لانا اب ممکن ہی نہیں تو پھر خواب دیکھنے پر بھی بھاری جرمانے عائد ہونے چاہئیں۔ پاکستان کو ناقابل اصلاح ریاست سمجھنے والوں کو اس نکتے پر دماغ صرف کرنا چاہیے کہ ناقابل اصلاح ترکی کو جسٹس پارٹی کی قیادت نے ناقابل یقین کامیابیوں کا راستہ کیسے دکھا دیا۔ خواب دیکھنے کی حد تک تو ہم ترکی کی جسٹس پارٹی کے ساتھ ہیں، مگر خواب کو تعبیر دیتے وقت ہمارے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ ترکی ڈرامے ''فاطمہ گل'' سے نت نئے ڈیزائن تو ہم دریافت کر لیتے ہیں مگر ترک صدر ''عبداللہ گل'' سے دو لائن کا سبق نہیں لیتے۔

یہی المیہ ہماری مذہبی سیاسی جماعتوں کا بھی ہے۔ مذہبی قیادت ''عرب بہار'' کے حوالے دیتے نہیں تھکے گی مگر جھم کی خزاؤں کا سامان کرنے کے لیے عرب سے بہار کا ایک جھونکا تک لینے پر آمادہ نہیں ہوگی۔ اس حقیقت پر سوچنے کے لیے وقت کسی کے پاس نہیں ہے کہ الاخوان المسلمون کی انگڑائی میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ جس نے آمروں کے تاج و تخت اچھال دیے۔ آئی ایم ایف کے وینٹی لیٹر پر لیٹے یورپ کا مرد بیمار اگر حیرت انگیز کروٹ لے کر بستر مرگ سے اٹھ گیا ہے تو یہ کس نسخۂ اکسیر کی کرشمہ سازی ہے۔ یعنی میر کا دیوان تو پڑھ لو مگر یہ نہ دیکھو کہ کتنے درد یکجا ہوئے تو میر نے ایک دیوان کیا۔ نہیں، یہ قیادت عوامل اور اسباب پر کبھی غور نہیں کرے گی۔ مذہبی قیادت

ہمیشہ قوم کو یہ کہہ کر ووٹ کھرے کروائے گی کہ ہمیں پاکستان میں سیکولر قوتوں سے مقابلہ درپیش ہے مگر اپنے کارکن پر بھی یہ راز کھلنے نہیں دے گی کہ سیکولر کا مطلب اور مفہوم کیا ہے۔ نظر بند عقیدت مند کو اپنے کھونٹے سے باندھے رکھنے کے لیے یہ احباب سیکولرز اور قدامت پسندوں کی تقسیم نظریات کی بنیاد پر نہیں کرتے بلکہ حلیوں اور بود و باش کی بنیاد پر کرتے ہیں۔ جو قبا پوش ہیں وہ قدامت پسند ہیں اور جو تھری پیس سوٹ اور ٹائی میں ہیں وہ سدا کے سیکولر ہیں۔ اس نکتہ نظر کو تقویت دینے کے لیے مذہبی قیادت لفظوں کی ایسی ترکیب باندھتی ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں پر بھی سیکولر ہونے کا گمان گزرے۔ انہوں نے ایک لکیر کھینچ دی ہے، لکیر کے اس پار جو ہم کھڑے ہیں بس یہی ہیں جن سے امت کی امامت کا کام لیا جا رہا ہے، اور لکیر کے اُس پار جو کھڑے ہیں وہ اس ملک کو سیکولر ریاست بنانا چاہتے ہیں، وہ استعمار کے زرخرید غلام ہیں، یہود کے انہی ایجنٹوں سے ہمیں کاٹنے کا معرکہ آن پڑا ہے۔ جس نے ہمیں ووٹ دیا گویا اس نے اسلام کو ووٹ دیا اور جس نے مخالف کو ووٹ دیا وہ استعمار کے ساتھ کھڑا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ تمام قومی و بین الاقوامی سروے رپورٹوں کے مطابق پاکستان کی 80 فیصد سے زائد کی آبادی اس ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتی ہے۔ حالیہ انتخابات سے صرف گیارہ روز قبل امریکی ادارے پیو ریسرچ سینٹر نے ایک سروے کروایا، سروے رپورٹ کے مطابق پاکستان کی 84 فیصد آبادی ملک میں شرعی نظام دیکھنا چاہتی ہے۔ اس رپورٹ کا مفہوم مخالف یہ ہوا کہ اس ملک کو سیکولر ریاست کے طور پر دیکھنے کے خواہشمند شہری صرف 16 فیصد ہیں۔ ایسے میں مذہبی جماعتوں کے اس دعوے کو کیونکر حقیقت تسلیم کر لیا جائے کہ ہم اس ملک میں سیکولر قوتوں سے برسرِ پیکار ہیں، یہ دعویٰ حقیقت کے برعکس ہونے کے ساتھ کافی حد تک گمراہ کن بھی ہے۔ یہیں سے ایک سوال جنم لیتا ہے کہ اگر اس ملک کی 84 فیصد آبادی سیکولر نظام کو مسترد کرتی ہے تو پھر سیاسی میدان میں مذہبی قوتوں کی پسپائی کا کیا مطلب لیا جائے؟ یہ وہ سوال ہے جس کا درست جواب مذہبی قیادت کی بقا کو خطرے سے دوچار کر سکتا ہے۔ آخری راستہ یہی ہے کہ سیکولرز کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے اور یہ اضافہ اسی صورت ممکن ہے کہ دائیں بازو کی جماعتوں کو بھی سیکولرز کے

خانے میں رکھ دیا جائے۔ ہر چند کہ پاکستان میں بائیں بازو کی صفوں میں بھی مذہبی قیادت سے بڑھ کر مذہب پسند پائے جاتے ہیں مگر یہ لیگیوں کو اور تحریک انصاف کو بھی سیکولر باور کروانے سے نہیں ہچکچاتے، اور قوم کو بڑے سسپنس کے ساتھ بتاتے ہیں کہ مذہب کی ناؤ منجدھار میں پھنسی ہے، اس ڈوبتی ناؤ کو اگر کوئی کنارے لگا سکتا ہے تو وہ صرف ہم ہیں۔ پانچ برس سے ان کے اس دعوے میں شدت آئی ہے کہ اگر ایوان میں ہم تشریف فرما نہ ہوتے تو اٹھارویں ترمیم میں توہین رسالت ایکٹ کا خاتمہ کر دیا جاتا، امتناع قادیانیت آرڈیننس کو منسوخ کر دیا جاتا، اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سے "اسلامی" کو مٹا دیا جاتا، وہ تو ہم تھے تو بچت ہو گئی۔ حقیقت حالانکہ اس کے برعکس ہے۔ مسلم لیگیوں پر کلام کی کوئی گنجائش موجود نہیں کہ وہ دائیں بازو کے سرخیل ہیں، صرف موجودہ حکومتی کابینہ کا اگر آپ جائزہ لیں تو اس میں اکثریت مذہبی رجحان کے حامل افراد کی ملے گی۔ مجموعی طور پر ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں ہے جو اس ملک کو سیکولر ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتا ہو۔ اگر توہین رسالت ایکٹ اور امتناع قادیانیت آرڈیننس میں کسی ترمیم کی بات آئی تو مذہبی قیادت سے بڑھ کر یہی افراد رکاوٹ بن جائیں گے۔ مذہبی قیادت کا نہیں، یہ ہر مسلمان کے ایمان کا مسئلہ ہے۔ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے میں نصرت بھٹو جیسی سیکولر خاتون کا کردار کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ ہم تو خوش قسمت ٹھہرے کہ سیکولر بھی ملے تو ذوالفقار علی بھٹو جیسے کہ جنہوں نے اسلامی سربراہی کانفرنس کی بنیاد رکھی۔ ابھی دو برس قبل جب گورنر سلمان تاثیر کے قتل کے بعد پارلیمنٹ میں توہین رسالت ایکٹ ختم کے خاتمے کی آوازیں اٹھیں تو دفاع کے لیے سیکولر جماعت پاکستان پیپلز پارٹی کے وزیر قانون بابر اعوان اٹھے، وزیر قانون کی حیثیت سے بابر اعوان نے وزیر اعظم کو ایک تفصیلی خط لکھا، اس خط میں بابر اعوان نے بائبل، گیتا، قرآن وسنت، آئمہ مجتہدین کی آراء اور تمام مکاتب فکر کے نکتہ نظر کی روشنی میں واضح کیا کہ توہین رسالت ایسے جرم کی سزا پر کسی سمجھوتے کا تصور ممکن نہیں ہے۔ یاد ش بخیر! مشرف دور میں حقوق نسواں بل جب پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا تو اس پر قوم پرست راہنما محمود خان اچکزئی کا ردعمل ایم ایم اے کے ممبران سے زیادہ شدید تھا، اسی قوم پرست راہنما نے پارلیمنٹ میں اپنا ووٹ نظام عدل ریگولیشن کے حق میں دیا تھا۔ ابھی حال ہی میں جب توہین رسالت پر مبنی Innocence of Muslims

نامی مووی ریلیز ہوئی سب سے طاقتور احتجاج سیکولر جماعت کے سیکولر راہنما غلام احمد بلور نے ریکارڈ کروایا، اس فلم کے ڈائریکٹر کو انہوں نے نہ صرف یہ کہ واجب القتل قرار دیا بلکہ اس کے سر کی قیمت بھی لگائی۔ اسی طرح تحریک انصاف کا نعرہ ہی یہ ہے کہ ہم ایک "اسلامی فلاحی ریاست" کا قیام چاہتے ہیں، عمران خان کی تقریر ایاک نعبدو ایاک نستعین سے شروع ہو کر "پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ" پر ختم ہوتی ہے۔ پاک فوج کا ماٹو آج بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ آرمی چیف کہتے ہیں کہ پاکستان کی اگر نظریاتی اساس محفوظ نہیں رہی تو کچھ بھی محفوظ نہیں رہ پائے گا۔ ایسے میں کوئی بتلائے کہ وہ سیکولر قوت ہے کہاں جس سے ان اصحاب مشک و عنبر کو معرکہ درپیش ہے؟ اگر یہ سیکولرز واقعی ایک قوت ہیں تو کوئی بتلائے کہ کہاں ہیں؟ اگر وہ ایک حقیقی قوت نہیں ہے تو پھر مذہبی قیادت کا یہ گرتا ہوا گراف چہ معنی دارد؟ جانتے ہیں سیکولر قوت کیا ہوتی ہے؟ سیکولر قوت وہ ہوتی ہے جو ترکی میں پائی جاتی ہے۔ خبر ہے کہ مقابلہ کسے کہتے ہیں؟ مقابلہ اسے کہتے ہیں جو ترکی میں طیب اردوان کر رہا ہے۔

سوال مکرر عرض ہے، 80 فیصد سے زائد کی آبادی اگر ملک کو ایک سیکولر ریاست کے طور پر دیکھنا نہیں چاہتی تو پھر ایوان میں یہ اقلیتوں کی طرح کیوں بیٹھے ہیں۔ حقیقت پر اگر آئیں تو اس کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ ان جماعتوں کے کھوکھلے نعرے ہیں۔ وہ نعرے جس کی یہ عملی وضاحت نہیں کر پاتے۔ یہ تصویر میں رنگ بھرنے کی اپنی سی کوشش تو کر لیتے ہیں مگر تصویر کو فریم میں بٹھا نہیں پاتے۔ مذہبی قیادت کا نعرہ یہ ہے کہ ہم ملک میں شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں، ہم ریاست مدینہ کو اپنا رول ماڈل سمجھتے ہیں، ہماری ریاست کے خدوخال ریاست مدینہ جیسے ہوں گے۔ یہاں سے دماغوں میں ایک سوال بہت شدت کی انگڑائی لیتا ہے کہ فرض کیجیے اقتدار کی زمام آپ کے ہاتھ میں ہے، سیاہ و سفید کے آپ مالک ہیں، آپ اکائی سے دہائی کی طرف آئیں اور بتائیں کہ شرعی نظام نافذ کرنے کا طریقہ کار کیا ہوگا؟ یہ ریاست جو سود کے نظام پر کھڑی ہے اس نظام کا کیا کریں گے؟ جواب ہوگا "ہم اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں گے"۔ مگر کیسے؟ اس سوال کے بعد ان کی گفتگو منطق اور فلسفے کا ایک گھنا جنگل بن جائے گی۔ دوسری وجہ مذہبی قیادت کا رویہ ہے۔ مذہبی قیادت عوام کے بنیادی مسائل سے دلچسپی

نہیں رکھتی، ٹماٹر پیاز کی چڑھتی ہوئی قیمتوں سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مہنگائی اور بے روزگاری ان کا دردِ سر نہیں ہے۔ راوی چین ہی چین میں ہو یا بے چین انہیں بہر طور شریعت نافذ کرنی ہے۔ لاہور میں ایک ہی اسٹیج پر جلوہ افروز بیالیس جماعتوں کی قیادت دہلی اور ممبئی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی بات تو کرتی ہے مگر مہنگائی، بے روزگاری، لاقانونیت اور دہشت گردی کو اوور ٹیک کرتے ہوئے آگے نکل جاتی ہے۔ مذہبی قیادت کو وفاق میں اب تک تو اقتدار نہیں ملا، شاید کہ یہ امید کبھی تو برآئے، مگر وہ دن آنے سے پہلے مذہبی قیادت کا رویہ وہی ہے جو افغانستان کا کنٹرول حاصل کرنے کے بعد طالبان کا تھا۔ پاکستان کی آبادی طالبان دور حکومت کو مذہبی قیادت کے ٹریک ریکارڈ کے طور پر دیکھتی ہے۔ طالبان کے پاس موقع تھا کہ وہ امارت کے قیام کے بعد ثابت کرتے کہ کار جہاں بانی کی بھی وہ اہلیت رکھتے ہیں۔ صحیح خطوط پر وہ نئے افغانستان کو ڈیزائن کرتے۔ مگر انہوں نے نئی زندگی کا آغاز وہاں سے کیا جہاں پہنچ کر اختتام ہوا کرتا ہے۔ افغانستان ایک زرخیز ملک ہے، جغرافیائی طور پر اسے ایشیا کا دل کہا جاتا ہے، اسی لیے اقبال نے کہا تھا کہ ایشیا کی ترقی افغانستان کی ترقی سے مشروط ہے۔ افغانستان کے کوہ و دمن میں قدرت کے بے پناہ ذخائر موجود ہیں، اسی لیے بڑی طاقتیں للچائی ہوئی نظروں سے افغان کوہساروں کو دیکھتی ہیں۔ سونا چاندی لوہا تانبا اور کوئلہ تو رہا ایک طرف، افغان کوہساروں میں موجود لیتھیم کی دھات (جس سے لیپ ٹاپ موبائل فون کی بیٹریاں اور دیگر اشیاء وغیرہ بنتی ہیں) ہی اگر برآمد کرلی جائے تو افغانستان صرف گیارہ برسوں میں عرب امارات سے ایک صدی آگے نکل سکتا ہے۔ ایسے افغانستان میں طالبان حکومت کی ترجیح یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ موزوں معاشی پالیسی لے کر آتے، ایمرجنسی بنیادوں پر ترقیاتی منصوبوں کا آغاز کیا جاتا۔ روزگار کے مواقع پیدا کیے جاتے۔ تعلیم اور صحت جیسے دو بنیادی شعبوں میں بہتری لائی جاتی۔ غیر ملکی سرمایہ کاروں کو سرمایہ کاری کی دعوت دی جاتی۔ خطے کے ممالک کو قریب لانے کے ذرائع پیدا کیے جاتے۔ دنیا سے سفارتی تعلق قائم کرنے پر غور کیا جاتا۔ مگر سب معاملات اس کے برعکس ہوئے۔ معاشی پالیسی ان کی شاید یہ تھی کہ نماز کے اوقات میں دکانیں بند کروائی جائیں۔ تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ بچیوں کی تعلیم پر پابندی عائد کردی۔ نوجوانوں کو روزگار فراہم کرنے کے بجائے وہ فیتے لے کر داڑھیاں ناپنے

لگ گئے۔ صحت کے شعبے میں بہتری لانے کے بجائے ہاتھ کاٹنے کے لیے چور کی تلاش میں لگ گئے۔ دنیا کو قریب لانے کے بجائے انہیں اس بات کی فکر تھی کہ پاکستان کی مذہبی قیادت کو قریب لایا جائے، اس میں وہ کامیاب رہے، اسی کا نتیجہ ہوا کہ طالبان حکومت خطے کی بڑی معاشی قوتوں سے دور ہوگئی۔ سفارتی تعلقات قائم کرنے کے بجائے انہوں نے بامیان میں کھڑے محمود غزنوی کے عہد سے پہلے کے بدھا بت بموں سے اڑا دیے۔ اگر افغانوں کی ڈیمانڈ یہی تھی تو یہ سب قابل اعتراض نہیں ہے، یہی کرتے، مگر جب تک سماج کا معیار زندگی بلند نہ کردیا جائے، سماج کو بنیادی حقوق مہیا نہ کردیے جائیں، معاشی طور پر سماج کو خوش حال نہ کردیا جائے، تب تک اخلاقی طور پر ریاست کو چور کا ہاتھ کاٹنے کی فکر چھوڑ دینی چاہیے۔ بے روزگاری اور شہری حقوق کی معطلی جرائم کو جنم دیتی ہے، جرائم کے اگر اسباب موجود ہیں تو قصور وار سماج نہیں بلکہ ریاست ہے۔ ریاست اپنی ذمہ داری ادا کرے تو پشت پر کوڑے مارنے کا حق بھی رکھتی ہے، سنگسار کرے یا ہاتھ کاٹے یہ اس کا اختیار ہے۔ مگر طالبان نے ریاستی ذمہ داریوں سے اجتناب برتا، تسلیم کہ انہیں کچھ کرنے نہیں دیا گیا، مگر جو کر سکتے تھے وہ بھی تو نہیں کیا۔ ثبوت تک بھی نہیں دے سکے کہ ریاست کو سماج کی آخری درجے میں بھی کوئی فکر ہے۔ ثبوت دیا تو اس بات کا کہ ہم کرمنل لاء کے نفاذ میں طاق ہیں، وہ کرمنل لاء، جس کا نمبر ریاست کی سمت متعین کرنے کے بعد آتا ہے، انہوں نے آغاز ہی کرمنل لاء سے کردیا۔ بس ایک بات کا ڈھول پیٹا گیا کہ بے مثال امن انہوں نے قائم کیا تھا۔ بے شک یہ امن مثالی تھا، مگر اور بھی غم تھے زمانے میں امن کے سوا۔ کسی بھی درد کا درماں نہ ہوا۔ منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ ریاست اور سماج میں اعتماد کا فقدان پیدا ہوگیا، اسی لیے وقت آنے پر طالبان حکومت کو کوئی ہمنوا نہ ملا۔ یہاں تک کہ انہوں نے بھی منہ پھیر لیا جنہوں نے بدھا کے مجسموں کو بموں اور راکٹوں سے اڑا کر بت شکنوں میں اپنا نام درج کروانے کا مشورہ دیا تھا۔

پاکستان میں مذہبی قیادت کو عوامی پذیرائی نہ ملنے کی یہی بنیادی وجہ ہے۔ بہار ہو کہ خزاں انہوں نے شریعت ہی نافذ کرنی ہے۔ جس معمار کو حالات نے دیواروں کے بیچ چن دیا ہے یہ اس کو بھی تسبیح تھامنے کی تلقین کریں گے۔ جنہیں اپنے بچوں کے سر بازاروں کے بیچ سے پڑے مل رہے ہیں ان سے بھی یہ عماموں کا اصرار کریں گے۔ آبلہ پا مسافروں کا مرہم ان کے پاس یہ ہے

کہ چہل خلاف شرع نہ پہنچ جائے۔ سروں پر سے چھتیں اڑ گئی ہیں انہیں بے پردگی کا غم کھائے جارہا ہے۔ پاؤں کے نیچے سے زمین کھسک رہی ہے اور یہ مصلے لیے کھڑے ہیں۔ نہیں، ایسا نہیں ہوگا۔ ترکی میں اردوان کے انقلاب پر شادیانے بجانے سے بات نہیں بنے گی، اردوان کے وژن کی طرف بھی آنا ہوگا۔ اردوان آسمان سے ایوان میں نہیں ٹپکا تھا۔ چار برسوں میں میئر کے طور پر اس نے استنبول کی تقدیر بدلی تو اس کو ایوان پہنچنے کا راستہ ملا۔ اور ایوان میں پہنچ کر وہ پہلے ہی برس شراب کی سرعام فروخت پر پابندی لگا سکتا تھا، وہ آتے ہی حجاب پر عائد ناجائز پابندی اٹھا سکتا تھا۔ ہر کام سے پہلے وہ بھی سیکولر آئین کے بخیے ادھیڑ سکتا تھا۔ دو تہائی اکثریت کے ساتھ وہ سیاہ وسفید کا مالک تھا، وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ مگر نہیں، کچھ بھی کرنے سے پہلے اردوان نے ترکی کو بے مثال معاشی قوت بنایا، کرپشن کا خاتمہ کیا، سماج کو تمام بنیادی حقوق فراہم کیے، تعلیمی انقلاب برپا کیا، صحت کی مفت سہولیات ہر شہری کو فراہم کیں، سستا انصاف مہیا کیا، بچیوں کی تعلیم کے لیے پالیسی بنائی، بے شمار ادارے قائم کیے، خواتین کو حقوق دیے، نوجوانوں کو روزگار دیا، شیر خوار بچوں کو دودھ الاؤنس دیا، بزرگ شہریوں کے وظائف مقرر کیے، یتیم اور بے سہارا بچوں کی کفالت کی، معذور شہریوں کا بوجھ ریاست کے کندھوں پر ڈالا، قرضوں کی لعنت سے نجات دلائی، فی کس آمدنی دو فیصد سے متجاوز کر دی، زندگی کا معیار اس قدر بلند کر دیا کہ ترک شہریوں نے بھی کبھی تصور نہیں کیا تھا۔ تمام ضروریات مکمل ہوئیں تو سماج کو یقین ہوا کہ ریاست ہی درحقیقت ہماری ماں ہے۔ ریاست اور سماج کا یہ رشتہ مکمل ہوا تو جسٹس پارٹی نے سیکولر آئین میں ترمیم کے لئے اپنے عزائم کا کھل کر اظہار کیا۔ اسرائیل کی اکڑفوں نکالی۔ یورپی یونین کونسل کو آنکھیں دکھائیں۔ مغربی بلاک کو دن میں تارے دکھائے۔ اب عالمی ذرائع ابلاغ استعماری قوتوں کو ا کسانے میں مصروف ہیں، ترکی کی سیکولر قوت گیزی پارک کی آڑ لے کر وزیر اعظم طیب اردوان سے استعفے کا مطالبہ کر رہی ہے، مگر ترکی کے جبہ پوش مسلمان اور سکرٹس پہنی لبرل لڑکیاں بیک آواز طیب رجب اردوان کی پشت پر کھڑی ہیں۔ مسلم دنیا کی قیادت اس کے ہمدم اور ہمقدم ہے۔ محسنوں کا ساتھ کوئی نہیں چھوڑتا، مگر ثابت کرنا پڑتا ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے سینے میں ہے۔ پہلے اپنے حصے کی شمع جلانی پڑتی ہے۔ اربکان کی طرح۔ اردوان کی طرح۔

مصر!

کچھ لوگوں کا کردار قوموں کی تعمیر میں کلیدی ہوا کرتا ہے۔ ان کی شاخ فکر پر پھوٹنے والے خیالات بکھرے ہوئے ہجوم کے لیے منزل کا نشان ثابت ہوتے ہیں۔ اخلاقی پسماندگی کا شکار ہو جانے والی نسلوں کو اپنے مرکز کی خبر یہی لوگ دیا کرتے ہیں۔ یہ اپنے لیے نہیں جیتے۔ گردوپیش سے یہ بے خبر نہیں رہتے۔ ایک درد یہ اپنے سینوں میں اٹھائے پھرتے ہیں۔ خنجر جس پر بھی چلے، روح ان کی تڑپتی ہے۔ ہواؤں کی مخالف سمت پر یہ سفر کرتے ہیں۔ دنیا اگر تھکتی نہیں تو ان کا عشق کبھی ہارتا نہیں۔ منہ زور ہواؤں میں وہ جنون کا دیا جلائے رکھتے ہیں۔ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرتے ہیں۔ نیا جہاں تخلیق کرتے ہیں۔ تیغ ہلال کی طرح وہ عیش نیام سے گزرتے ہیں۔ کم وقت میں زیادہ مقابل کرتے ہیں۔ سفر اور صرف سفر کرتے ہیں۔ دامن سے کانٹے الجھتے ہیں اور پاگل کتے بھونکتے رہ جاتے ہیں، مگر وہ یکسو رہتے ہیں۔ سفر نہیں رکتا۔ کارواں نہیں رکتا۔ عزم جواں رہتا ہے۔ اور بالآخر تاریک راتوں کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔ ایک نیا خورشید وہ تراش لاتے ہیں۔ صبح روشن ہو جاتی ہے۔ قوموں کی زندگیوں میں آنے والے انہی افراد میں سے ایک مصر کے امام حسن البنا ہیں۔

امام حسن البنا مصر کے شہر اسماعیلیہ میں ایک سکول کے پرائمری ٹیچر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب شاہ فاروق مصر کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ حسن البنا کا تعلیمی کیریئر زیادہ تر قاہرہ میں رہا۔ قاہرہ میں رہتے ہوئے حسن البنا نے مصر کا اصل چہرہ دیکھا۔ مصری نوجوان اخلاقی دیوالیہ پن کا شکار تھا۔ اس کا دن بستر پر شام سڑک پر اور رات نائٹ کلب میں تھی۔ تازہ سائنسی عیاشیوں کی تاب نہ لانے کی وجہ سے وہ جھٹے سے اکھڑ گئے تھے۔ گھر ویران اور شراب خانے آباد ہو گئے تھے۔ مصر کے بازاروں میں حسن بک رہا تھا۔ نسوانیت بیچ بازار میں ڈھول کی تھاپ پر تھرک رہی تھی۔ سب سے ارزاں نرخ عزت و عصمت کے چل رہے تھے۔ معاشرہ تباہی کی طرف

جارہا تھا۔ گردوپیش کے حالات سے وہ بے نیاز ہو گئے تھے۔ اور دوسری طرف اہل نجد کی حالت بھی پتلی تھی۔ سرخ کلاہان از ہر بھی جنس ارزاں کی طرح دین خدا کی باتیں کیے جارہے تھے۔ شیوخ و سالک کے خطبے منطق کے الجھے ہوئے قضیے بن گئے تھے۔ انہیں شاہ فاروق اور اس کی آل اولاد کی خدمت گزاری سے فرصت نہیں تھی۔ واعظِ شہر کی تلقین کمرشل ہو گئی تھے۔ راہ راست پر آنے کا درس بس اتنا ہی دیتے جتنا کہ جیب اجازت دیتی۔ نوجوان کی بے راہ روی میں جتنی شدت آتی شیخ کے گھر اتنا ہی چراغاں ہوتا۔ جہالت نے ان کے علم و تحقیق کے چار چراغ روشن رکھے ہوئے تھے، خلاف شرع وہ تھوکتے نہیں تھے مگر کوئی موقع وہ چوکتے بھی نہیں تھے۔ حقیقت خرافات میں کھو گئی تھی۔ سوسائٹی روایات میں کھو گئی تھی۔ گو کہ مصر کے گنبد و منار سے اذان کی مسحور کن صدائیں تو اٹھ رہی تھیں مگر روح بلالی ڈھونڈے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔ قوم بگڑتی ہے بگڑے، دستار کے پیچ و خم نہ بگڑیں۔ اس صورت حال نے ایک پرائمری ٹیچر کو بے چین کر دیا۔ اسی بے چینی نے پھر مصر کا وہ چین لوٹا دیا جو فراعنہ مصر نے ہائی جیک کر لیا تھا۔

امام حسن البنا نے صرف تئیس سال کی عمر میں مصر کے سامری کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر کس لی۔ انہوں نے نوجوانوں کو ٹارگٹ کیا۔ یہ طے کیا کہ مصر کے نوجوان کو روایات سے نکال کر حقیقت سے روشناس کرایا جائے گا۔ اس کام کے لیے دعوت کے فطری اسلوب کو انہوں نے اختیار کیا۔ حسن البنا گفتگو کی خدا بخشندہ قوت سے مالا مال تھے، اس قوت گویائی کو درد دل سے ہم آہنگ کیا تو نیل کی موجوں میں اضطراب پیدا ہو گیا۔ کیونکہ جو بات دل سے نکلتی ہے اثر رکھتی۔ اثر انگیز گفتگو نے لڑکھڑاتے جام بدست نوجوانوں کو مبہوت کر دیا۔ پہلوئے یار میں بے خبری کی ہنکل مار کر بیٹھی ہوئی مدہوش جوانی کا خمار اترنے لگا۔ سماعتیں ایک نئی آواز اور ایک نئی صدا سے متعارف ہوئیں، وہ صدا صرف یہ تھی کہ "اے نوجوان مسلم! کبھی تدبر بھی کیا تم نے؟ کیا تم بدل جانے کے لیے پیدا کیے گئے تھے؟ یا تم بدل دینے کے لیے بھیجے گئے تھے؟ کس چیز نے تمہیں اپنے راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ فرعون کے سامریوں نے تمہاری نگاہوں پر پردہ ڈال دیا ہے، اپنے گریبانوں میں جھانک کر ذرا اپنی خبر لو کہ تم کون ہو، جس سکون کے حصول میں تم سرگرداں ہو وہ تمہارے من میں کہیں پنہاں ہے، جس مسیحا کی تمہیں تلاش ہے وہ تم خود ہی تو ہو، اپنے آپ سے

اپنی ذات کا پتہ مانگو۔ چلو نکلو ان گھن چکروں سے، تمہیں خبر دیتا ہوں کہ تم کون ہو، تم وہی ہو جن کی دنیا ستاروں سے کہیں آگے ہے۔ جسے قیصر و کسرا کے نیچے سے تخت کھینچنے والی قوم نے اپنی آغوش میں پالا ہے۔ حسن البنا کی اس صدا نے مصر کا ماحول بدل دیا، نوجوان نسل کو جلد احساس ہو گیا کہ ہم جس راستے پر چل پڑے ہیں اس کے اگلے سرے پر سراب کے سوا کچھ بھی نہیں، اس سفر کا انجام وہیں ہو گا جہاں خدا ملتا ہے اور نہ ہی وصال صنم ہوتا ہے۔ قاہرہ کی فضاؤں کو تو صنم آشنا ہونا ہی تھا، سو ہو گئیں مگر حسن البنا کی آواز صرف پانچ سال کے عرصے میں مصر کی ہر بستی میں جا پہنچی۔ جس مرجھائے ہوئے دل پر بھی اس آواز نے دستک دی وہاں دھڑکنیں جی اٹھیں۔ حقیقت کا ادراک ہوتا چلا گیا۔

اب لوہا گرم تھا صرف ایک ضرب لگانے کی دیر تھی۔ ان نوجوانوں کو منظم کر کے پیروں کا استاد بنانے کا چیلنج درپیش تھا۔ انیس 1927 میں حسن البنا نے ڈگری لی اور 1928 میں الاخوان المسلمون تنظیم کی بنیاد رکھ دی۔ اخوان المسلمون کی بنیاد پڑتے ہی ملک بھر کے نوجوان اخوان سے وابستہ ہونے لگے۔ حسن البنا نے تعلیم و تربیت پر ہمیشہ سے زور دیا، تربیتی بنیادوں پر اخوان کے وابستگان کی اخلاقی اور اصلاحی تربیت کے لیے باقاعدہ ایک نظام تربیت وضع کیا۔ خواتین کے لیے اخوات المسلمین کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا۔ طلبہ، مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں کے لیے الگ الگ ونگز قائم کیے گئے، ہر ونگ کے لیے الگ اصلاحی نصاب ترتیب دیا۔ آج بھی اخوان المسلمون کی قیادت اخلاقی تربیت اور تعلیم پر کوئی سمجھوتہ نہیں کرتی، یہی وجہ ہے کہ اخوانی دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود ہوں ان کے اخلاق کی پاکیزگی، کردار کی بلندی اور علمی پختگی ان کی پہچان کروا دیتی ہے۔ حسن البنا نے دعوت کے سلسلے کو پھیلانے کے لیے ذرائع ابلاغ کا بھرپور استعمال کیا۔ انداز گفتگو کی طرح ان کا اسلوب نگارش بھی بہت دل نشین تھا۔ اخوان المسلمون کی ذمہ داریوں کے ساتھ انہوں نے مصر کے مشہور زمانہ رسالے "المنار" کی ادارت بھی سنبھالی، المنار کے اداریوں اور مضامین نے ادبی حلقوں کو اخوان کی طرف متوجہ کیا۔ امام حسن البنا حساس دلوں میں ذوق کے راستے سے داخل ہوئے اور دل کی کائنات بدل دی۔ اسی دوران انہوں نے اخوان کے تین آفیشل جرائد بھی شروع کیے، ان میں سے ایک روزنامہ ایک ہفت روزہ

اور ایک ماہنامہ تھا، اسے حسن البنا کا کمال ہنر ہی کہیے کہ روزنامہ اخوان المسلمون کا شمار مصر کے مین سٹریم اخبارات میں ہوا۔ حسن البنا نے تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی برابر جاری رکھا، ادب کا رنگ لیے ان کی ہر کتاب ایک شاہکار ہے، تقریباً دس کتابیں انہوں نے لکھیں۔ صرف ان کی ڈائری ہی ایک ایسا اثاثہ ہے براہ راست دل کو متاثر کرتا ہے۔ ابلاغ کے ان تمام ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے دنیا کو اخوان کے وجود کا مقصد بتایا۔ انہوں نے کہا کہ سماوی احکامات کی پیروی ہمارا مقصد ہے، دانائے سبل کی زندگی ہمارے لیے مثال ہے، جہاد ہمارا راستہ اور شہادت ہماری آرزو ہے۔ اول اول نوجوان حسن البنا کا ٹارگٹ تھے مگر خوان المسلمون کے قیام کے بعد زندگی کے ہر شعبے میں اخوان کی نمائندگی دکھائی دینے لگی۔ شیخ سید قطب اور عبدالقادر عودہ جیسی بڑی علمی وادبی شخصیات بھی امام حسن البنا کی دعوت سے متاثر ہوکر اخوان کا حصہ بنے۔ مصر کے ہر بازار میں شیخ کی آوز پہنچ گئی۔ جلد یہ آواز مصر کے سرحدات کو عبور کرنے لگی۔ ان کی یہ آواز عرب وعجم اور شرق وغرب میں عملی طور پر نظر آنے لگی۔ جب فلسطین کے مسلمانوں پر کڑا وقت آیا تو حسن البنا نے کے نوجوانوں نے ہی فلسطین پہنچ کر اسرائیل کے خلاف مزاحمت کی، فلسطین میں برپا کی گئی ان نوجوانوں کی مزاحمت سے ہی حماس جیسی تنظیم نے جنم لیا۔ روس نے جب افغانستان میں جارحیت کا مظاہرہ کیا تو اس کا جواب دینے کے لیے اخوانی نوجوان بڑی تعداد میں پاکستان اور افغانستان آئے، عرب دنیا سے جو جنگجو پشاور آتے اور پھر افغانستان میں خط اول پر جان مارتے وہ یہی اخوانی نوجوان تھے، بعد کے منظرنامے میں انہی عرب مزاحمت کاروں نے القاعدہ کے نام سے خود کو منظم کیا۔ اسی طرح حسن البنا نے علامہ اقبال کے دوقومی نظریے کی کھل کر حمایت کی۔ ہجرت کے ہنگام مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر بین الاقوامی سطح پر جو احتجاج ہوا اس میں ایک نمایاں آواز حسن البنا کی تھی، احتجاج ریکارڈ کروانے کے لیے حسن البنا نے جواہر لال نہرو کو جو جارحانہ خطوط لکھے وہ ان کے درددل پر گواہ ہیں۔ قیام پاکستان کے فوری بعد قائداعظم محمد علی جناح کو لکھے گئے حسن البنا کے تہنیتی خطوط تاریخ کا ایک خوشگوار حصہ ہیں۔ حسن البنا نے قائداعظم محمد علی جناح کو قرآن کا مجید کا ایک نسخہ بھی تحفے میں بھیجا جو آج بھی مزار قائد پر واقع میوزیم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ حسن البنا کی اس جدوجہد نے اخوان المسلمون کو ایک عالمگیر تحریک بنادیا۔ اخوان کا

پیغام تمام عرب ممالک میں تیزی سے پھیلا۔ کہا جاتا ہے اسی تحریک سے متاثر ہو کر ابوالاعلیٰ مودودی نے جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی تھی، مگر اس میں کوئی صداقت نہیں ہے۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ ایک ہی وقت میں دنیا کے دو مختلف خطوں پر موجود دو شخصیات کے دماغ میں ایک ہی آئیڈیا وارد ہوا۔ اسی آئیڈیے کی بنیاد پر بہت ہی کم عرصے کے فرق سے دو جماعتوں کی بنیاد پڑی۔ یہ حسن اتفاق تھا جس نے باہمی اتفاق کے راستے پیدا کیے۔ اس اتفاق نے بھی اخوان المسلمون کی آواز کو بھرپور طاقت بخشی۔

سچائی کی دعوت پر سب سے پہلے جو چیز لبیک کہتی ہے وہ ''آزمائش'' ہے۔ اخوان المسلمون کی آواز جس تیزی سے پھیلی اس سے دگنی رفتار کے ساتھ آزمائش کے مراحل آ پہنچے۔ اہرام مصر کانپ اٹھے تھے۔ فراعنہ وقت کے اونچے محلات میں خطرات کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ مصر کے ساحروں نے کسی موسیٰ کے قدموں کی چاپ سن لی تھی۔ فرعون کو ایک بار پھر سامریوں نے بچے قتل کرنے کا مشورہ دیا۔ یہاں سے قرون اولیٰ کے بعد تاریخ کی سب سے بڑی قربانی کا آغاز ہوا۔ دریائے نیل کے کنارے موسیٰ اور فرعون کی ایک نئی جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ کا پس منظر کیا تھا؟ اور پیش منظر کیا ہے؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

الاخوان المسلمون اور نو عشروں پر پھیلی ایک رات!

اصلاحی تحریکوں کی خوش قسمتی کہیے کہ آزمائش ان کے حصے میں نہیں آتی۔ خاص طور سے وہ اصلاحی تحریکیں جن کی نظریاتی اساس یہ ہے کہ ظالم کو کبھی ظالم نہیں کہا جائے گا اور یہ کہ نظام کی بات نہیں کی جائے گی۔ اسی طرح سیاسی تحریکوں کا المیہ یہ ہے کہ اخلاقی تربیت اور فکری پاکیزگی سے اکثر وہ بے نیاز رہتی ہیں۔ مگر امام حسن البنا اور ان کی اخوان المسلمون کا معاملہ اور تھا۔ اخوان المسلمون بنیادی طور پر ایک اصلاحی تحریک تھی، نوجوانوں کی اخلاقی تربیت کے لیے جو نصاب امام حسن البنا نے ترتیب دیا وہ کسی بھی اصلاحی نصاب سے بہتر اور جامع تھا۔ امام حسن البنا ایک روایتی مسلمان نہیں تھے، یہی وجہ تھی کہ ان کی محنت سینوں پر نہیں بلکہ دلوں پر تھی، ان کا ٹارگٹ سر نہیں بلکہ دماغ تھے، آنکھوں پر نہیں انہوں نے نگاہوں پر توجہ دی۔ چھوڑیے تاریخ کو، اخوان المسلمون کے کارکن خود اس کی بہتر مثال ہیں۔ مگر صرف سماج کی اصلاح سے کوئی بڑی تبدیلی واقع ہو نہیں سکتی۔ ریاست کی قوت سماج ہے اور سماج، ریاست کے بغیر دو قدم اٹھا نہیں سکتا، اسی لیے امام حسن البنا نے باکردار سماج کے ذریعے ریاست کی سمت متعین کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہی فیصلہ ہے جو تحریکوں کو آزمائش کی بھٹیوں سے گزار کر سچائی کا ثبوت مانگتا ہے۔

اخوان المسلمون کی تاریخ پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت نے امام حسن البنا کی نگاہ کو بلندی عطا کی تھی۔ اگلی صدی میں جھانکنے کی وہ صلاحیت رکھتے تھے۔ انہیں پہلے ہی روز اس حقیقت کا ادراک ہو گیا تھا کہ حالات کی جن پگ ڈنڈیوں پر کارواں چل پڑا ہے وہاں دامن سے کانٹے الجھنے کو بے تاب رہیں گے۔ پہلے دن سے لے کر آخری روز تک امام حسن البنا تحریک کے وابستگان کو ایک ہی تلقین کرتے رہے کہ "کوئی بھی افتاد ٹوٹ پڑے ہم مسلح جدوجہد کی طرف نہیں جائیں گے، آندھیاں جتنی بھی منہ زور ہوں ہمارا کام صرف یہ ہے کہ ہم تاریک راہوں پر چراغ بدست کھڑے رہیں گے"۔ پیشگی حفاظتی اقدام کے طور پر امام حسن البنا نے تعلیمی اداروں میں طلبہ اور اساتذہ کی سطح پر بیس بیس اور ستر ستر افراد پر مشتمل مختلف یونٹ تشکیل دیے۔ یہ یونٹ

''کتیبہ'' کے نام سے جانے جاتے ہیں، انہیں ایک فیملی کی شکل دی گئی، ان یونٹوں کی تشکیل اخوت کی بنیاد پر ہوئی، بھائی چارگی اور ایثار کی جو مثال ان گروپوں کی شکل میں امام نے قائم کی وہ قرون اولی کے بعد پوری تاریخ انسانی میں ایک حیران کن مثال ہے۔ یہی جذبۂ اخوت آج بھی اخوان المسلمون کی بنیاد ہے۔ ان یونٹوں میں مختلف رنگ ونسل کے سٹوڈنٹس تھے۔ ان کی تمام سرگرمیاں باہمی مشاورت سے ہوتی تھیں، ساتھ کھیلتے اور ساتھ پڑھتے، شب بیداریاں اور روحانی ریاضت بھی اتفاق رائے سے کرتے، گروپ میں کوئی ایک اخوانی مشکل کا شکار ہوتا تو باقی دس اس کی پشت پر ہوتے، چھٹیوں کے ایام بھی یہ باہمی مشاورت سے ڈیزائن کرتے، گروپ میں اگر کوئی پردیسی شامل ہوتا تو اس کی تشکیل مقامی اخوانی کے ساتھ کردی جاتی، عید گزارنے کے لیے اسے ساتھ لے جایا جاتا۔ مصر میں اخوان المسلمون پر آزمائش کا بدترین دور آیا تو دنیا سمجھی کہ اخوان المسلمون کے تار پود بکھر جائیں گے، اب اس جماعت کا نشان نہیں ملے گا۔ مگر جابر تہہ خاک جا پہنچے اور اخوانی ادھر ڈوب کر اُدھر نکلے۔ اخوان المسلمون کو اگر کسی چیز نے زندہ رکھا تو وہ یہی یونٹ (کتیبہ) تھے جو امام نے تشکیل دیے تھے، اور ان گروپوں کو قائم رکھنے والی چیز صرف اور صرف وہ ''اخوت'' تھی جس کا درس دیتے دیتے امام اس دنیا چلے گئے۔

شاہ فاروق کے عہد میں ہی اخوان المسلمون ایک ناقابل برداشت تحریک بن گئی تھی۔ صرف ایک سال میں اس کے رجسٹرڈ کارکنوں کی تعداد پانچ لاکھ سے تجاوز کرگئی تھی، ہمدردوں کو ملا کر ان کی تعداد اٹھارہ لاکھ سے متجاوز تھی۔ یہ صورت حال برطانیہ کے لیے بھی کچھ بہتر نہ تھی۔ برطانیہ کے مسلسل دباؤ کے نتیجے میں اخوان المسلمون کو 1948 میں کالعدم قرار دے دیا گیا۔ ہزاروں نوجوان گرفتار کر لیے گئے، دفاتر سیل کردیے گئے، راہنماؤں کی نقل وحرکت پر پابندی لگادی گئی۔ کچھ ہی دنوں بعد وزیراعظم نقراشی پاشا کو ایک نوجوان نے قتل کردیا۔ افواہ اڑادی گئی کہ وزیراعظم کو حسن البنا کی ایما پر قتل کیا گیا ہے۔ گرفتاریاں زوروں پر تھیں مگر حیران کن طور پر حسن البنا کو گرفتار نہیں کیا گیا، اگلے برس 1949 کو حسن البنا کو رات کی تاریکی میں قاہرہ کی سڑکوں پر قتل کردیا گیا، شاید ان کے لیے یہی سزا طے کی جاچکی تھی۔ پورا مصر سوگ کے عالم میں تھا۔ دیر وحرم ایک ہی صف میں ماتم کناں تھے، مسجد ومندر دونوں ہی اشکبار تھے۔ قاہرہ

میں کرفیو لگا ہوا تھا، آدم نہ آدم کی ذات۔ فرمان جاری ہوا کہ امام کا جنازہ رات کی تاریکی میں اٹھے گا مگر شرکت کی اجازت کسی کو نہیں۔ چھپ چھپا کر صرف ایک شخص امام البنا کے جنازے کو کندھا دینے آیا وہ بھی عیسائی تھا۔ عیسائی کا یہ کندھا درحقیقت امام البنا کی عظمت کی دلیل دے رہا تھا، گھر کے صرف پانچ افراد نے تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیے۔ آسیب زدہ شہر سے چار کاندھوں پہ اٹھنے والا یہ جنازہ اس شخص کا تھا جس کی تحریک سے وابستہ ہونے والے انسان مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے تھے۔

1952 میں جب مصر میں فوجی نقلاب آیا تو اخوان المسلمون نے حمایت کا اعلان کیا۔ صرف حمایت ہی نہیں، اخوانیوں نے اس انقلاب میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس حمایت کی بنیاد یہی تھی کہ شاہوں کا سورج شاہ فاروق کی صورت میں غروب ہو گیا۔ یہ انقلاب بنیادی طور پر جمال عبدالناصر کی جدوجہد کا ثمر تھا۔ جمال ناصر نے فوج میں ہم خیالوں پر مشتمل "حرکتہ الضباط الاحرار" نامی ایک گروپ تشکیل دیا، اسی گروپ نے 23 جولائی 1952 کو بغاوت کر کے سرکاری ریڈیو اسٹیشن، پولیس تھانوں، حکومتی دفاتر اور فوجی ہیڈکوارٹر پر قبضہ کیا تھا۔ اس بغاوت نے جمال ناصر کو ہیرو بنا دیا۔ 1956 میں مصر کے پہلے صدر جنرل نجیب کے بعد وہ صدر منتخب ہوا۔ جمال ناصر مصر کو مغربی بلاگ سے نکال کر اشتراکی قوتوں کے پاس لے گیا، نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ اور روس دونوں کو خطے میں اپنے مفادات کے لالے پڑ گئے۔ دونوں طاقتوں نے مفادات کی یہ جنگ مصر کی سرحدوں پر لڑی۔ روس جمال ناصر کو اسلحہ فراہم کر کے عراق شام اور یمن میں مداخلت پر اکساتا رہا اور امریکہ و برطانیہ دونوں اسرائیل کے ذریعہ مصر کا گھیراؤ کرتے رہے۔ یہاں سے جنرل نجیب کی برطرفی پر اخوان اور جمال ناصر کے بیچ پیدا ہونے والے اختلافات میں شدت پیدا ہو گئی۔ اخوان المسلمون کی قیادت نے گی لپٹی رکھے بغیر جمال ناصر کی پالیسیوں کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کیا۔ جمال ناصر سمجھ گیا کہ اخوان المسلمون اس کے لیے موسیٰ کا عصا ثابت ہو سکتی ہے، چنانچہ ناصر نے اخوان المسلمون کو ایک بار پھر ایک غیر قانونی جماعت ڈیکلیئر کر دیا۔ اخوان کے مرشد عام (سربراہ) حسن الہضیبی سمیت کئی راہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ صرف دو ماہ بعد اخوان المسلمون کے تمام جرائد و رسائل کالعدم قرار دے دیے گئے۔ پرانی کہانی دوبارہ دہرائی

گئی، جمال ناصر پر قاتلانہ حملہ ہوگیا، مصر کو عالمی قوتوں کا اکھاڑا بنانے والے جمال ناصر کی نظر گھوم پھر کر اخوانیوں پر ہی جا گئی۔ اخوانی قیادت نے واضح کیا کہ اخوان کی تمام تر جدوجہد غیر مسلح ہے تشدد پر وہ یقین نہیں رکھتے، مگر وہ آمر ہی کیسا جو کسی کی سن لے۔ حکم دیا کہ جہاں اخوانی نظر آئے دھر لیا جائے، المصری اخبار کے مطابق صرف دو ہفتوں میں گرفتار ہونے والے اخوانیوں کی تعداد ستر ہزار تھی۔ مرکزی قیادت پوری جیل پہنچادی گئی تھی۔ گرفتار ہونے والوں میں وقت کی دو بڑی علمی شخصیات شیخ سید قطب اور شیخ عبدالقادر عودہ بھی شامل تھیں۔ صفائی کا موقع فراہم کیے بغیر اخوانیوں پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ کیس تیزی سے نمٹایا گیا اور چھ مرکزی رہنماؤں کو سزائے موت سنادی گئی۔ حسن الہضیبی کی سزا بڑھاپے کی وجہ سے عمر قید میں بدل دی گئی۔ اسی مقدمے میں شیخ سید قطب کو پندرہ سال قید بامشقت سنائی گئی، انہیں معافی کی شرط پر رہائی کی پیشکش بھی ہوئی مگر انہوں نے معافی کی شرط ماننے سے انکار کردیا، وزارت تعلیم کی پیشکش بھی انہوں نے ٹھکرادی۔ ایک ہی رات میں مرکزی قیادت کو سولی چڑھا دیا گیا۔ مارچ 1964 میں ایمرجنسی ختم ہونے پر کارکنوں کو حسن الہضیبی اور شیخ سید قطب سمیت رہا کردیا گیا۔ مگر صرف ایک سال کے وقفے کے ساتھ اخوانیوں کی آزمائش کا تیسرا دور شروع ہوگیا۔ جولائی 1965 میں اخوانی قیادت پر الزام لگایا گیا کہ ایک سازش کے تحت انہوں نے حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس الزام کو بنیاد بنا کر کریک ڈاؤن شروع ہوا۔ اس بار خود سرکاری اعداد و شمار کے مطابق پچاس ہزار اخوانی گرفتار کیے گئے۔ آٹھ سو خواتین ان کے علاوہ تھیں، شہرہ آفاق ''روداد قفس'' لکھنے والی زینب الغزالی بھی انہی میں شامل تھیں۔ شیخ حسن الہضیبی اور سید قطب کو اس بار اہل خانہ سمیت گرفتار کرلیا گیا، اب کی بار حسن الہضیبی کو تین سال قید بامشقت سنائی گئی، درد و الم کی ایک دردانگیز داستان مکمل ہوئی اور حسن الہضیبی جان سے گزر گئے۔ سازش کیس میں سید قطب اور ان کے ساتھیوں پر بند کمرے میں مقدمہ چلایا گیا، ان کی پیروی کے لیے کسی وکیل کو پیش ہونے نہیں دیا گیا، کچھ لوگوں نے رضاکارانہ پیروی کا پیغام بھیجا مگر حکام نے منع کردیا۔ بالآخر 1966 کو اخوان کے ممتاز رہنما مصر کے سب سے بڑے مفکر عرب دنیا کے نامور ادیب اور دنیا کے منفرد اسکالر شیخ سید قطب کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔

نہر سویز نے جمال ناصر کو ہیرو بنایا اور جزیرہ نمائے سینا نے اسے زیرو بنا کر تاریخ کے دریائے نیل میں ڈبو دیا۔ 1970 میں جمال ناصر کا دور ختم ہوا اور انور سادات کا دور شروع ہوا۔ جمال ناصر نے حرکۃ الضباط الاحرار بنائی تو انور سادات اس کا حصہ بنا، ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کر کے انقلاب کا اعلان انوار سادات نے ہی کیا تھا۔ اس کا دور بھی اسرائیل کے ساتھ محاذ آرائی اور عرب ممالک کے ساتھ سینگ اڑانے میں گزرا۔ اسرائیل کا پہلا باضابطہ دورہ انور سادات نے ہی کیا تھا۔ کیمپ ڈیوڈ معاہدہ بھی اسی دور میں ہوا۔ اسی دور میں عرب لیگ نے مصر کی رکنیت ختم کر کے اپنا دفتر قاہرہ سے تیونس منتقل کیا۔ خارجہ پالیسیوں کے ساتھ انور سادات کی داخلہ پالیسیوں پر بھی آوازیں اٹھنا شروع ہوئیں، کرپشن کی کہانیاں گردش کرنے لگیں۔ وزیر دفاع محمد البداوی کی پراسرار ہلاکت نے کئی سوال اٹھا دیے۔ 1981 میں لیبیا کے قریب ہیلی کاپٹر حادثے میں اٹھارہ جرنیلوں کی ہلاکت نے جلتی پر تیل کا کام کر دیا، اس حادثے میں صرف پائلٹ کے بچ جانے سے معاملہ گھمبیر تر ہو گیا۔ انور سادات کے خلاف اٹھنے والی آوازوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ لیفٹ اور رائٹ سب ایک ہی پیج پر تھے۔ اسی لیے انور سادات نے بلاتفریق تمام تنظیموں کے خلاف کریک ڈاؤن شروع کر دیا۔ صحافیوں تک کو جیلوں میں ڈال دیا۔ طلبہ تنظیموں پر پابندی عائد کر دی۔ اس کریک ڈاؤن کے صرف ایک ماہ بعد قاہرہ میں 16 اکتوبر کو "یوم الفتح پریڈ" کے ہنگام انور سادات کو قتل کر دیا گیا۔ اب ستم دیکھیے کہ انور سادات کے خلاف سراپا احتجاج بھی جماعتیں تھیں، مگر قتل کے بعد ایکشن صرف اخوانیوں کے خلاف لیا گیا۔ تین سو اخوانی گرفتار کر لیے گئے۔ اسی میں سرگرم مذہبی راہنما ایمن الظواہری (جواب القاعدہ کے لیڈر ہیں) بھی شامل تھے۔ انگریزی زبان پر عبور رکھنے کی وجہ سے ایمن الظواہری جیل میں قید اپنے دیگر اخوانیوں کے ترجمان بنے۔ اسی وجہ سے عالمی سطح پر اس مقدمے کو بھرپور کوریج ملی، یہیں سے رہائی پانے کے بعد ایمن الظواہری افغانستان چلے گئے۔

1981 میں انور سادات کا دور رعونت انجام کو پہنچا اور حسنی مبارک کا عہد فرعونیت شروع ہوا۔ اس عہد کا آغاز بھی اخوان المسلمون کی آزمائش سے ہوا۔ یہ سیاہ دور طویل سہی، مگر اس کا آغاز آمریت کا انجام ثابت ہوا۔ یہ انجام کیسا تھا؟ یہ اگلی نشست میں۔ (انشاءاللہ)

تحریر اسکوائر تک!

مصر کا تیسرا صدر انور سادات تھا۔ انور سادات کو ایک بے ضرر جرنیل کی تلاش تھی جسے وہ اپنا نائب بنا سکے۔ نگاہ انتخاب حسنی مبارک پر ٹھہر گئی۔ خارجہ امور میں انور سادات حسنی مبارک کا استاد تھا اور داخلی امور میں حسنی مبارک انور سادات کا استاد تھا، مگر دونوں کی ایک دوسرے کو پڑھائی ہوئی پٹیاں مصر کو مہنگی پڑ گئیں۔ مصر کی خارجہ پالیسی تو تھی ہی ناکام داخلی طور پر بھی ملک انارکی کا شکار ہوا۔ تمام مخالف سیاسی قوتوں کو انور سادات نے لپیٹ دیا، جیلیں سیاسی کارکنوں اور صحافیوں سے بھر دیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ یوم الفتح پریڈ کے دوران انور سادات سات افراد سمیت قتل کر دیا گیا۔ 1981 میں انور سادات کا دور بلاختم ہوا اور اقتدار کی چھڑی حسنی مبارک کی بغل میں آ گئی۔ ابتدا میں ہر آمر کی طرح حسنی مبارک بھی نیک نامی ساتھ لایا۔ شائستہ لہجہ اور شستہ رویہ۔ جمہوری جملوں کی دل آویز تراش خراش نے اس کے وجود کو قابل برداشت بنا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ مصر کی گرتی ہوئی معیشت کو حسنی مبارک نے ہی سہارا دیا، اسی وجہ سے حسنی مبارک کو عام لوگوں کے دلوں میں نسبتاً بہتر جگہ بھی مل گئی۔ مگر خلیفہ تو انور سادات ہی کا تھا، اسی لیے جلد خلیفہ گری پر اتر آیا۔ وہی کیمپ ڈیوڈ معاہدہ جس نے انور سادات کو عرب دنیا میں تنہا کر دیا تھا اسی معاہدے کو اس نے مغربی قوتوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا۔ جلد اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ خطے میں امریکی اور برطانوی مفادات کو تحفظ دینے کے لیے اس کا وجود ناگزیر ہے۔ داخلی طور پر انور سادات قتل کیس کو بھی اس نے سیاسی پوائنٹ سکورنگ کے لیے استعمال کیا۔ اس کیس میں اخوانی راہنماؤں اور کارکنوں پر مقدمہ چلایا گیا، یہ مقدمہ بنیادی طور پر خالد اسلامبولی، عمر عبدالرحمن، ایمن الظواہری اور حامد کشک پر چل رہا تھا۔ اس مقدمے کو حسنی مبارک نے عالمی سطح پر بھرپور کوریج دلوائی، اس کوریج کا مقصد بھی عالمی قوتوں کی توجہ حاصل کرنا تھا۔ حسنی مبارک نے صدارت کے دوسرے ہی سال مذہب پسند سابق فوجی

اہلکار خالد اسلامبولی کو پھانسی چڑھا دیا۔ متعدد اخوانیوں کو ملک بدر کردیا۔ اخوان المسلمون کی سرگرمیوں پر کڑی بندشیں عائد کردیں۔ رہنماؤں کو نظر بند کیا۔ اس طرح حسنی مبارک مغربی قوتوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہوگیا کہ مصر کے "شدت پسندوں" کا ناطقہ بھی صرف میں ہی بند کرسکتا ہوں۔ بھرپور اعتماد حاصل کرنے کے نتیجے میں حسنی مبارک مصر کا مطلق العنان بادشاہ بن گیا۔

وقت کے ساتھ آمر ضرور بدل جاتے ہیں مگر آمریت نہیں بدلتی۔ خالص آمروں سے وہ آمر ہمیشہ بدتر ثابت ہوا جو نیم سیاست دان ہو، حسنی مبارک اور ہمارے پرویز مشرف اس کی بہترین مثالیں ہیں۔ داخلی طور حسنی مبارک نے جلد ہی ان پالیسیوں کو فروغ دینا شروع کیا جس کا مشورہ وہ انور سادات کو دیا کرتا تھا، حسنی مبارک نے مستقل بنیادوں پر ایمرجنسی نافذ کیے رکھی۔ ماتحت سیکیورٹی ادارے قوت کا مرکز بن گئے۔ شہری حقوق معطل کردیے گئے۔ ایمرجنسی کے نفاذ کے لیے حسنی مبارک کی دلیل بھی بہت دلچسپ تھی۔ حسنی مبارک کہتا کہ سیاحت مصر کی سب سے اہم انڈسٹری ہے، اس انڈسٹری کو بچانے اور فروغ دینے کے لیے لازمی ہے کہ مذہبی شدت پسندوں کو لگام دی جائے، شدت پسندوں کو لگام دینے کے لیے ہمارے پاس ایک ہی آپشن ہے کہ ایمرجنسی نافذ کردی جائے۔ مخالفین کے لیے وہ ہمیشہ فرعون مصر ہی ثابت ہوا، چالیس برسوں میں خدائی کے دعوے کے سوا اس نے وہی کیا جو فراعنۂ مصر نے کیا۔ اخوانیوں کے لیے یہی دورسب سے بدتر ثابت ہوا۔ سچ کے لیے اس کے دربار میں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ جس پر بھی موسیٰ ہونے کا گمان گزرتا اس پر زمین تنگ کردیتا۔ خود پورے مصر کے بچے ڈکار جائے کوئی بات نہیں، موسیٰ اگر کسی کو ایک مکا بھی رسید کردے تو ملک بدر کردیتا۔ مصر کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس نے اسرائیلی توپوں کے سائے میں بٹھا دیا۔ صدارتی محل سے لے کر جامعۃ الازہر تک پورے مصر کو امریکہ کا ترجمان بنا دیا۔ چالیس برسوں تک یہ کھیل جاری رہا، یہ عرصہ بہت ہوتا ہے، حسن مصر کی قلوپطرہ کا ہی کیوں نہ ہو اتنے عرصے میں آنکھیں بالآخر اکتا ہی جاتی ہیں۔ مصری عوام کا دم گھٹنے لگا تھا۔ سینوں میں بغاوت نے انگڑائیاں لینا شروع کردی تھیں۔ مجموعی طور پر ادھر اخوانیوں نے بھی بہت قربانی دے لی تھی۔ زینب الغزالی کی کتاب روداد قفس پڑھیے تو روح کانپ اٹھتی

ہے۔قیدیوں کی رانوں پر چیرے لگا کر مسالہ بھرا گیا،بے شمار اخوانیوں کو ملک بدر کردیا گیا،نوجوانوں کو بیلی کاپٹر سے مصر کے صحراؤں میں پھینکا گیا،گھنٹوں وہ تپتے صحرا میں مارے پیاس کے جان سے ہاتھ دھو گئے،پرندوں کا وہ رزق ہو گئے،غیر اخلاقی سزاؤں کا وہ شکار ہوئے،عزت نفس پر حملے ہوئے،خواتین جنسی تشدد کی شکار ہوئیں،مردوں کو بے اولادی کے زخم دیے گئے۔آج بھی اخوان کے ایسے بزرگ موجود ہیں جو بے اولاد ہیں،ان سے بے اولادی کے اسباب پوچھیے تو دل اور دماغ لرز اٹھیں گے۔یہ قربانیاں بہت ہو گئی تھیں۔ایسے میں اخوان کے راہنمائی صف بندیوں کے ساتھ نئی حکمت عملی پر عمل پیرا ہوئے۔

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ اخوانی تشدد کی طرف کبھی نہیں جائیں گے۔حسن البنا کی تربیت سے وہ منہ نہیں پھیرتے۔اسی لیے جبر کا مقابلہ صبر سے کرتے ہیں،بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ وہ صرف حکمت عملی بدلتے ہیں۔حسنی مبارک کے دور میں انہوں نے حکمت عملی بدلی جس کا کریڈٹ سابق مرشد عام عمر تلمسانی کو جاتا ہے۔نئے حالات میں انہوں نے طے کیا کہ اپنے کردار کا سہارا لے کر عوام میں اپنی جڑوں کو مضبوط کیا جائے گا۔سو اپنی دعوت انہوں نے جاری رکھی،خدا کی زمین تنگ نہیں تھی اور درویش کے پاؤں سلامت تھے،حسن البنا کی ''دس وصیتیں'' کو پلو سے باندھا اور دنیا میں پھیل گئے۔لیبیا گئے تو قذافی نے ستم ڈھایا،قذافی پاکستان کے ارباب ریشمی رومال کو نوازتا رہا اس لیے انہیں یہ جبر آج بھی یاد نہیں۔شام میں بشارالاسد کے والد حافظ الاسد نے اخوانی فکر رکھنے والوں کی بستی ہی بلڈوز کردی،حیران ہوں کہ تب تو کوئی نہ چیخا۔اسی طرح اخوانیوں نے تعلیم پر توجہ دی۔اخوان المسلمون میں تعلیم پر جتنا زور دیا گیا شاید ہی دنیا کی کسی تحریک میں دیا گیا ہو،امام حسن البنا کا درس ہی یہی تھا،اخوان المسلمون کی قیادت پر ایک نظر ڈالیں تو شاید ہی کوئی ایسا لیڈر ملے جو پی ایچ ڈی ڈاکٹر نہ ہو،اخوان کا مرشد عام (سپریم لیڈر) بننے کے لیے تو بنیادی معیار ہی اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ ہے،اور یہ ریکارڈ ضروری نہیں کہ ایم اے اسلامیات ہو۔موجودہ مرشد عام شیخ بدیع کو ہی لے لیجیے،وہ مصر کی بنی سیف یونیورسٹی میں پیتھالوجی کے پروفیسر رہے،بے شمار تعلیمی پراجیکٹ کی تکمیل ان کے ریکارڈ کا حصہ ہے،انتظامی صلاحیتوں پر وہ خود کو سند کے طور پر منوا چکے ہیں۔اسی طرح مصر کے معزول صدر محمد مرسی نے

میٹریل سائنس میں امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی، کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ہی وہ پروفیسر بھی رہے،یہ معمولی سی دو مثالیں ہیں۔اسی طرح اخوان نے کردار سازی کو فوکس کیا۔لوگوں کے دلوں پر محنت کی،اچھے گھروں کے بگڑے ہوئے بچوں کو راہ راست پر لائے،ان کی اخلاقی تربیت کی،اخوت کا وہی درس انہیں دیا جو اخوانیوں کا امتیازی وصف ہے۔رفاہی اور فلاحی خدمات میں مثال قائم کی،مفت میڈیکل سینٹرز قائم کیے،دیہاتوں سے شہروں کی طرف آنے والے مزدوروں کو فری ٹرانسپورٹ سہولت دی،فری ایجوکیشن سینٹرز قائم کیے،دیہی علاقوں کی طرف خصوصی توجہ دی گئی،نادار بچوں کے لیے بے مثالی تعلیمی پراجیکٹ شروع کیے۔رنگ نہیں دیکھا،نسل نہیں دیکھی،ووٹ چیک نہیں کیے،بس خدمت کی،قوم کا اعتماد حاصل کیا۔پھر وہ وقت بھی آپہنچا جس کے لیے فضا کو سازگار بنایا جارہا تھا۔

2011 میں تیونس حکام نے عزیزی نامی ایک غریب تعلیم یافتہ شہری کا ٹھیلا الٹ دیا،نتیجے میں عزیزی نے خودکشی کرلی۔صبح دم تیونس کی عوام اٹھی اور شاہوں کا تخت الٹ دیا۔نصف صدی کے بعد عرب دنیا میں انقلاب کی ایک بہار آ گئی۔شاہی درباروں کی رونقیں کچھ دیر کے لیے مدہم پڑگئیں۔عوام کا سیلاب اٹھا جس کے بعد طبعیت سے تخت گرائے گئے اور تاج اچھالے گئے۔ عرب بہار کا پہلا جھونکا تیونس انقلاب اور خوشگوار جھونکا مصر انقلاب ثابت ہوا۔نقارۂ خدا بج گیا،تحریر اسکوائر پر خلق خدا کا ہجوم امڈ آیا،فضاؤں میں صرف ایک آواز تھی" ہم انقلاب کے بغیر گھر نہیں لوٹیں گے"،اٹھارہ روز تک تحریر اسکوائر پر تاحد نگاہ سر ہی سر تھے۔بے لگام فوجی ٹینک سامنے کھڑے تھے۔خونخوار ہیلی کاپٹر فضاؤں میں گشت کر رہے تھے۔گولیاں برس رہی تھیں۔سینکڑوں افراد قتل کردیے گئے۔بجدہ ریز انقلابیوں پر پانی کا پریشر مارا گیا۔اس خون ریز اقدام کا جواب صرف ایک نعرے کی صورت دیا گیا" حسنی نامنظور"۔پتھراؤ کیا اور نہ ہی املاک جلائیں،گاڑیاں جلیں اور نہ ہی کوئی شیشہ ٹوٹا۔جبر کا مقابلہ صرف صبر سے کیا۔بالآخر 11 فروری 2011 کو آمریت کا سورج چالیس برس کی مسافت طے کرنے کے بعد نیل کے اس پار غروب ہوا۔نوے برسوں پر پھیلی ایک تاریک رات کا پردہ چاک ہوا۔افق پر سحر کی ایک امید پھوٹی۔فراعنہ عرب کی فرسودہ نشانی انسانوں کے دریائے نیل میں غرق ہوگئی۔

نومبر 2011 کے آغاز پر مصر میں انتخابی عمل شروع ہوا۔ تین مرحلوں میں ہونے والے یہ انتخابات تین ہفتوں تک جاری رہے۔ اخوان المسلمون کی نمائندہ سیاسی جماعت فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی نے بھرپور حصہ لیا۔ کانٹے کا مقابلہ ہوا۔ سیکولر طاقتیں تو روایتی حریف تھیں مگر النور پارٹی جیسی مذہب پسند جماعت بھی آستین چڑھائے مقابلے کو سامنے تھی۔ بیوروکریسی نے اخوانیوں کے خلاف باقاعدہ مہم برپا کی۔ مختلف دائروں میں پھیلے ہوئے حریفوں کے نشانے پر صرف اخوان المسلمون تھی۔ اس کے باوجود 498 کے ایوان میں فریڈم اینڈ جسٹس پارٹی نے 235 نشستیں حاصل کرلیں۔ صدر محمد مرسی 52% ووٹوں کے ساتھ مصر کی تاریخ کے پہلے جمہوری صدر منتخب ہوئے۔ مغربی قوتوں کے پیٹ اسرائیل میں مروڑ اٹھا۔ پہلے دن سے سازشوں کے جال بچھنے لگے۔ بمشکل ایک سال ہی گزرا تھا کہ 3 جولائی کی شام مصری آرمی چیف جنرل عبدالفتاح السیسی نے شب خون مار کر مرسی حکومت کا دھڑن تختہ کردیا۔ محمد مرسی کا جرم کیا تھا؟ اور غلطیاں کیا سرزد ہوئیں؟ یہ اگلی نشست میں (انشاءاللہ)

تحریر اسکوائر سے آگے!

مصر میں انقلاب کے بعد ہونے والے پارلیمانی انتخابات میں اخوانیوں کی کامیابی نے سب کو سکتے میں ڈال دیا۔ اسرائیل کو تو اس وقت بھی تشویش ہی ہوا کرتی تھی جب اخوانی مصر میں آزادانہ سرگرمیاں انجام دیتے، اب تو اخوانی برسر اقتدار تھے۔ اب امریکہ سے اسرائیل تک شدت کی ایک ایسی لہر اٹھی کہ اگر زمین کے نیچے اٹھتی تو آٹھ اعشاریہ دس کی شدت کا زلزلہ ریکٹر سکیل پر ریکارڈ کیا جاتا۔ اسرائیل نے سرکاری نتائج کے بعد اسرائیل کے وزیر اعظم نے پہلا بیان ہی یہ جاری کیا کہ ''مصر میں شدت پسندوں کی کامیابی پر اسرائیل کو تشویش ہے''۔ اسرائیل اور ہمنواؤں کی یہ تشویش بالکل بجا تھی، کیونکہ ترکی کی مثال ان کے سامنے تھی۔ عالمی قوتوں کو اس بات کا اندازہ ہے کہ ترکی میں جسٹس اینڈ ڈیویلپمنٹ پارٹی کی پہلی کامیابی کی وجہ پاکباز اور باکردار قیادت تھی۔ اور اب ان کی مسلسل جیت کے پیچھے ان کی کارکردگی کارفرما ہے۔ وہ ڈیلیور کرتے ہیں اور عوام ووٹ کرتے ہیں۔ یہاں مصر میں بھی عوام نے اخوانیوں پر اعتماد کیا تو اس کا سبب اخوانی قیادت کا کردار تھا۔ اخوانیوں نے اپنی فلاحی ورفاہی سرگرمیوں سے عوام کو متاثر کیا تھا۔ کرپشن کا ان کے ہاں تصور نہیں اور ڈیلیور کرنا وہ جانتے ہیں۔ کل ملا کر صرف شدت پسندی کا طعنہ ہی رہ جاتا ہے جو ان کو دیا جا سکتا تھا مگر اب کیا کیجیے کہ عوام کی طاقت سے وہ منتخب ہو کر آئے تھے۔ عالمی طاقتوں کو یقین تھا کہ اگر اخوانی بھی ڈیلیور کر گئے تو اگلی مدت میں دگنی طاقت کے ساتھ یہ لوٹ کر ایوان میں آئیں گے۔ آخری آپشن یہی تھا کہ اخوانیوں کو ڈیلیور کرنے کا موقع ہی نہ دیا جائے۔ عالمی طاقتوں کو اپنے اس خواب کی تعبیر صدر مرسی کی خارجہ پالیسی میں مل گئی۔ خارجہ پالیسی کی سمت متعین ہونے سے پہلے ہی کچھ اقدامات محمد مرسی کے لیے ناقابل معافی ''جرائم'' بن گئے۔ انہی ''جرائم'' کا سہارا لے کر بیرونی قوتوں نے مصر کی داخلی ہم خیال قوتوں کو مرسی کے خلاف مزاحمت پر اکسایا۔

صدر مرسی کے جرائم کیا تھے؟ ایران نے غیر جانبدار سربراہی کانفرنس منعقد کی، کانفرنس میں ایرانی حکام نے صدر مرسی کو مدعو کیا، بہتر تعلقات کی بنیاد رکھنے کے لیے صدر مرسی نے اس کانفرنس میں شرکت کی جو اسرائیل کے ساتھ سعودیہ کو بھی ناگوار گزری۔ گزشتہ برس جب گستاخانہ مواد پرمبنی ایک مووی امریکہ سے ریلیز ہوئی تو سب سے سخت ردعمل صدر محمد مرسی کی طرف سے ہی دیکھنے میں آیا۔ جنرل اسمبلی کے اجلاس میں بھی انہوں نے پورے شدومد کے ساتھ اس مسئلے کو اٹھایا۔ دنیا بھر سے آئے ہوئے سربراہان، ذرائع ابلاغ اور مبصرین کو مخاطب کر کے انہوں نے کہا کہ ''جو ہمارے نبی کا احترام نہیں کرے گا ہم اس کا احترام نہیں کریں گے''۔ صدر مرسی نے ایک جرم یہ کیا کہ حماس کے زیر اثر علاقے غزہ سے لگنے والی پٹی پر رفح کراسنگ کھولنے کا حکم جاری کر دیا، رفح کراسنگ کے کھل جانے سے غزہ کی اقتصادی ناکہ بندی ختم ہوگئی۔ رواں برس جب اسرائیل نے غزہ پر حملہ کیا تو صدر مرسی نے بھرپور احتجاج کر کے اپنے ''جرائم'' میں اضافہ کر دیا۔ اس حملے پر پوری دنیا میں احتجاج ہوا، مگر آج نصف صدی کے بعد مصر سے اٹھنے والی احتجاج کی یہ صدا اسرائیلی قیادت کو بہت اجنبی لگی۔ یہ تمام جرائم اس وقت ناقابل معافی بن گئے جب صدر مرسی نے اسرائیل سے مطالبہ کیا کہ وہ مصر سے خریدی جانے والی گیس کی قیمت مارکیٹ ریٹ کے مطابق ادا کرے۔ حسنی مبارک سے بھائی بندی والے ریٹ پر گیس خریدنے والے اسرائیل کی طبیعت پر مرسی کا یہ جائز مطالبہ بھی بھاری گزرا۔ ہمیشہ کی طرح امریکہ اور اسرائیل کی پریشانی کا یہ مقدمہ عالمی ذرائع ابلاغ نے لڑا۔ ذرائع ابلاغ نے ان تمام واقعات کو ایک دوسرا رنگ دیا۔ یہ باور کروایا کہ صدر مرسی کی نظر درحقیقت کیمپ ڈیوڈ معاہدے پر لگی ہوئی ہے۔ مصر کی داخلی سیکولر قوتوں کو یہ پیغام پہنچایا گیا کہ صدر مرسی اپنے ان تمام اقدامات کے ذریعہ کیمپ ڈیوڈ معاہدے کو متاثر کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا ہوگیا تو امریکہ اپنی سالانہ ڈیڑھ ارب ڈالر کی امداد بند کر دے گا۔ اپوزیشن اور فوج نے مصر میں اسی ڈیڑھ ارب کا راگ الاپ کر اپنے حامیوں کو اکسایا جس کا نتیجہ فوجی بغاوت کی صورت میں سامنے آیا۔

محمد مرسی کو اپنے ''جرائم'' کی سزا دینے کے لیے بیرونی طاقتوں نے مصر کی داخلی قوتوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ لبرل جماعتوں این جی اوز اور ہیومن رائٹس کی تنظیموں کو متحرک کیا گیا۔ یہاں

سے صدر محمد مرسی کی دانشمندی کا امتحان شروع ہوا۔ صدر مرسی کے لیے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ متحرک بیرونی قوتوں کو اندرونی قوتوں کے کاندھے پر بندوق رکھنے کا موقع فراہم نہ کرتے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ صدر مرسی اس چیلنج میں ایک حد تک ناکام دکھائی دیے۔ صدارت کے آغاز پر ہی صدر مرسی عمر رسیدہ آرمی چیف جنرل طنطاوی کو طاقتور جرنیلوں سمیت رخصت کر چکے تھے۔ اعلیٰ عدلیہ کی مداخلت سے بچنے کے لیے صدر مرسی نے ایک حکم نامہ جاری کر کے صدر کے اختیارات میں توسیع کر دی تھی۔ ان دو اقدامات کا سہارا لے کر مخالف قوتوں نے مرسی کو متنازع صدر بنا دیا تھا۔ اپوزیشن یک زبان چیخ رہی تھی کہ صدر مرسی اختیارات میں توسیع کر کے آمر بننا چاہتے ہیں۔ ان چیخوں کی سر، تال، لَے عالمی ذرائع ابلاغ سنوار رہا تھا۔ اپوزیشن نے نیا آئین تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیا۔ حالات اس قدر کشیدہ ہوئے کہ آئین کی منظوری کے لیے ریفرنڈم کروانا پڑا۔ ریفرنڈم میں ساٹھ فیصد سے زائد ووٹ پڑے اور نیا آئین منظور ہو گیا۔ کثرت رائے کے ساتھ آئین کی منظوری اخوانیوں کی بڑی کامیابی تھی۔ سوال یہ اٹھایا گیا کہ اتنی عجلت میں آرمی چیف کی برطرفی اور صدارتی اختیارات میں توسیع کیا ایک بروقت فیصلہ تھا؟ شاید یہ ایک بروقت فیصلہ ہی تھا۔ شاید مرسی کے پاس صدر مرسی کے پاس ان اقدامات کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مگر ایسے حالات میں کہ جب تمام مخالف قوتیں ایک ہی کیمپ میں جمع ہو گئی تھیں، صدر مرسی نے آئین میں توہین رسالت کی شق شامل کر کے بہت ہی عجلت کا مظاہرہ کیا۔ مصر کو توہین رسالت کے حوالے سے ایسا کوئی بحران درپیش نہیں کہ اس کی بنیاد پر مخالفین سے آخری حد تک محاذ آرائی کی جاتی۔ بحران یہ تھا کہ عالمی قوتوں کی ایما پر حکومت مخالف تمام جماعتیں سالویشن فرنٹ کی چھتری تلے جمع ہو چکی تھیں۔ اور جو اس چھتری کے نیچے نہیں تھے وہ ذاتی حیثیت میں مخالفت کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو رہے تھے۔ داخلی طور پر مصر لبرلز، اسلامسٹ، سخت گیر مذہب پسندوں، یوتھ ایکٹیوسٹ اور قبطی عیسائیوں میں تقسیم ہے۔ متحرک اور طاقتور این جی اوز کے اثرات اس کے علاوہ ہیں۔ ان میں صدر مرسی کی ہمنوا طاقت اگر کوئی ہو سکتی تھی تو وہ سلفیوں کی النور پارٹی ہو سکتی تھی، مگر النور پارٹی بھی براہ راست سعودیوں کے زیر اثر تھی۔ ہر چند کہ توہین رسالت والے آرٹیکل میں النور پارٹی صدر مرسی کے ساتھ تھی مگر اس کے سوا النور پارٹی کے پاس کوئی راستہ بھی نہیں

تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس پورے دورانیے میں النور پارٹی کی خواہش یہ رہی کہ صدر مرسی ناکام ثابت ہوں تاکہ مذہبی ووٹ النور پارٹی کی طرف ٹرانسفر ہو جائے۔ باقی جماعتوں کی پشت پر مغربی طاقتیں تھیں اور النور پارٹی کی پشت پر سعودیہ تھا۔ بیرونی مداخلت سے اٹھنے والے سیاسی بحران سے نمٹنے کا ایک ہی حل تھا کہ حریف کو تنقید کا موقع فراہم نہ کیا جاتا۔ اپوزیشن کے خدشات کو دور کیا جاتا۔ سابق اخوانی راہنماؤں سے ہاتھ ملایا جاتا۔ النور پارٹی کو قریب لانے کا کوئی راستہ نکالا جاتا۔ مخالف قوتوں کو مطمئن کیا جاتا۔ ہر قیمت پر سیاسی استحکام پیدا کر کے معاشی ترقی کا سفر شروع کیا جاتا۔ حکومت مخالف قوتوں کو موقع کی تلاش تھی۔ ایک ایسا موقع جس کا سہارا لے کر یہ باور کروایا جاسکے کہ مصری حکومت عوامی مسائل میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنے ''فرسودہ'' خیالات قوم پر مسلط کرنے کی آرزومند ہے۔ صدر مرسی کے قبل از وقت اقدامات نے ان قوتوں کو یہ موقع فراہم کر دیا۔ مصر کے بازاروں میں وہ یہی ڈھنڈورا پیٹتے رہے کہ صدر مرسی مصر میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے اپنے اختیارات میں توسیع چاہتے ہیں۔ عوام میں پھیلائے گئے اس قسم کے شکوک وشبہات کو صدر مرسی اپنی حکمت عملی بدل کر ہی زائل کر سکتے تھے۔ مگر بدقسمتی سے صدر مرسی حالات کے ان تقاضوں کو زیادہ خاطر میں نہ لائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی قوتوں کو اندرونی طاقت کا کندھا میسر آ گیا۔ یوں صدر مرسی کے ساتھ وہی منیر نیازی والا معاملہ ہو گیا کہ

کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج سانوں مرن دا شوق وی سی

صدر مرسی کی سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے دو قسم کے خیالات سامنے آئے ہیں۔ پہلا خیال یہ ہے کہ ''صدر مرسی کو ترک صدر طیب اردوان کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونا چاہیے تھا، وہ ثابت کرتے کہ اپنی قوت بڑھانے سے زیادہ انہیں معاشی بحران کی فکر ہے''۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ مرسی کی یہی حکمت عملی بہتر تھی جو انہوں نے اپنا رکھی تھی۔ دوسرے خیال کے حامل تجزیہ کاروں کی دلیل یہ ہے کہ ''ترکی اور مصر کے حالات مختلف ہیں، مختلف حالات کے تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں، ترکی میں طیب اردوان انتخابات کے نتیجے میں آئے تھے جبکہ مصر میں انقلاب آیا تھا، انقلاب کا تقاضا یہ تھا کہ پہلی فرصت میں سابق آمر کی باقیات کا صفایا کر دیا جاتا، یہی مرسی نے کیا

اور بہتر کیا"۔ اب اگر ترکی اور مصر کے حالات کا جائزہ لیں تو مرسی کے اقدام کی حمایت کرنے والوں کی دلیل بے وزن ہو جاتی ہے۔ جہاں تک تعلق ہے انقلاب کا، انقلاب کے نتیجے میں آنے والی تبدیلی تحریر اسکوائر تک تھی۔ تحریر اسکوائر سے اگر آگے کو بڑھیں تو کاروان انقلاب بکھر جاتا ہے۔ آمریت کے خاتمے پر قوم متفق تھی۔ لبرلز، مذہب پسند، یوتھ ایکٹوسٹ اور قبطی عیسائی ایک ہی صف میں ایک ہی نعرے کے ساتھ کھڑے تھے۔ آمریت کا خاتمہ ہوا تو کوئی ایک متفقہ انقلابی لیڈر برسر اقتدار نہیں آیا، بلکہ انتخابات کا اعلان ہوا۔ انتخابات میں ہر جماعت نے اپنے منشور اور دستور کے ساتھ اترنا تھا۔ نظریاتی تفاوت اور دستوری اختلاف نے انقلاب میں حصہ لینے والی تمام جماعتوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں لا کھڑا کیا تھا۔ لبرلز ور اسلامسٹوں کی ایک واضح تقسیم سامنے آئی مگر اسلامسٹ بھی تقسیم در تقسیم کی لعنت کا شکار تھے۔ انتخابات میں اخوان المسلمون نے چالیس فیصد سے زیادہ ووٹ لیے اور حکومت بنانے کی حقدار بنی۔ سو تسلیم کیا جانا چاہیے کہ اردوان کی جسٹس پارٹی طرح اخوانیوں کی فریڈم پارٹی بھی انتخابی عمل کے نتیجے میں ہی برسر اقتدار آئی۔ اگر ترکی اور مصر کے حالات کا موازنہ کریں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ اردوان اور مرسی دونوں کو ایک جیسے چیلنجز کا سامنا تھا۔ طیب اردوان برسر اقتدار آئے تو انہیں بھی سخت گیر سیکولرز سے ہی معرکہ درپیش تھا۔ مصر کی طرح ترکی کی سیکولر قوتوں کی پشتیبان بھی فوج ہی تھی۔ ایسا بھی نہیں کہ یہ سیکولر طیب اردوان کے ماضی سے بے خبر تھے۔ سب جانتے تھے کہ طیب اردوان دراصل عدنان میندریس اور نجم الدین اربکان کا لیٹسٹ ورجن ہے۔ ترکی میں مذہب کی بقا کی جنگ لڑنے والوں میں اردوان کا نام نمایاں رہا۔ جیلوں میں بھی وہ تحریکی سرگرمیوں کی وجہ سے ہی گئے۔ مگر اقتدار کی زمام تھامنے کے بعد انہوں نے سیکولر قوتوں کے ساتھ فوج کو بھی مطمئن رکھا۔ سیکولر آئین کے حوالے سے دس برس تک کسی قسم کے ارادے ظاہر نہیں کیے۔ ملک معاشی بحران کا شکار تھا۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے ترکی کو یورپ کا مرد بیمار بنایا ہوا تھا۔ اسی لیے اردوان نے صرف تعمیر و ترقی کو فوکس کیا۔ اپنی کارکردگی کے ذریعے اردوان نے ان شہریوں کو متاثر کرنے کی کوشش کی جو نظریاتی وابستگیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ صرف اپنے مفادات کے اسیر ہوتے ہیں۔ وہ طے کر چکے ہوتے ہیں کہ جو ڈیلیور کرے گا ہم

طبقہ بنیادی مسائل کے حل کو کارکردگی کہتا ہے۔ یہ رونما ہونے والے واقعات سے اثر لیتا ہے۔ ایک دو واقعات رونما ہوتے ہیں اور اس طبقے کی مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ ان کی سوچ میں قرار اور فیصلے میں پختگی آ جاتی ہی۔ یکسوئی کے ساتھ یہ اپنا فیصلہ سنا دیتا ہے۔ اخوانی قیادت نے اس طبقے کو متاثر کرنے کے بجائے خالص اخوانیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ صدر مرسی نے جماعت کا اثر زیادہ لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سینٹرل پاور کو یہ میسج گیا کہ اخوانی قیادت کو حکومتی ذمہ داریوں سے زیادہ فکر اس بات کی ہے کہ مصر کے آئین کو بیک جنبش لب چھ کلمے پڑھوا دیے جائیں۔ ترکی میں یہی حکمت عملی نجم الدین اربکان نے اختیار کی جو کہ ناکام رہی۔ وہ بھی ایک خالص جمہوریت پسند راہنما تھے۔ مگر انہیں سازشوں، پابندیوں، معزولیوں، نظر بندیوں، پھانسیوں اور گرفتاریوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔ اسی لیے اربکان سے علیحدگی اختیار کرکے طیب اردوان نے نئی حکمت عملی کے ساتھ نئی سمت پر سفر شروع کیا۔ ایک نیا تجربہ انہوں نے کیا، جس کے مثبت نتائج سامنے ہیں۔ اخوانی قیادت اگر صدر محمد مرسی کو بھی اسی تجربے کو بنیاد بنانے کا موقع دیتی تو نتائج مختلف ہوتے۔ پہلی حکومتی مدت میں اگلی مدت کی تیاری کی جاتی اور اگلی مدت میں پچھلی کارکردگی کا سہارا لے کر فیصلے صادر کیے جاتے۔ جسٹس پارٹی کی طرح۔ رفتہ رفتہ۔ آہستہ آہستہ۔

تھا۔حقیقت یہ ہے کہ اس پورے دورانیے میں النور پارٹی کی خواہش یہ رہی کہ صدر مرسی ناکام ثابت ہوں تاکہ مذہبی ووٹ النور پارٹی کی طرف ٹرانسفر ہو جائے۔باقی جماعتوں کی پشت پر مغربی طاقتیں تھیں اور النور پارٹی کی پشت پر سعودیہ تھا۔بیرونی مداخلت سے اٹھنے والے سیاسی بحران سے نمٹنے کا ایک ہی حل تھا کہ حریف کو تنقید کا موقع فراہم نہ کیا جاتا۔اپوزیشن کے خدشات کو دور کیا جاتا۔سابق اخوانی راہنماؤں سے ہاتھ ملایا جاتا۔النور پارٹی کو قریب لانے کا کوئی راستہ نکالا جاتا۔مخالف قوتوں کو مطمئن کیا جاتا۔ہر قیمت پر سیاسی استحکام پیدا کر کے معاشی ترقی کا سفر شروع کیا جاتا۔حکومت مخالف قوتوں کو موقع کی تلاش تھی۔ایک ایسا موقع جس کا سہارا لے کر یہ باور کروایا جا سکے کہ مصری حکومت عوامی مسائل میں دلچسپی لینے کے بجائے اپنے ''فرسودہ'' خیالات قوم پر مسلط کرنے کی آرزو مند ہے۔صدر مرسی کے قبل از وقت اقدامات نے ان قوتوں کو یہ موقع فراہم کر دیا۔مصر کے بازاروں میں وہ یہی ڈھنڈورا پیٹتے رہے کہ صدر مرسی مصر میں اسلامی آئین کے نفاذ کے لیے اپنے اختیارات میں توسیع چاہتے ہیں۔عوام میں پھیلائے گئے اس قسم کے شکوک وشبہات کو صدر مرسی اپنی حکمت عملی بدل کر ہی زائل کر سکتے تھے۔مگر بدقسمتی سے صدر مرسی حالات کے ان تقاضوں کو زیادہ خاطر میں نہ لائے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بیرونی قوتوں کو اندرونی طاقت کا کندھا میسر آ گیا۔یوں صدر مرسی کے ساتھ وہی منیر نیازی والا معاملہ ہو گیا کہ

کج شہر دے لوگ وی ظالم سن
کج سانوں مرن دا شوق وی سی

صدر مرسی کی سیاسی حکمت عملی کے حوالے سے دو قسم کے خیالات سامنے آئے ہیں۔پہلا خیال یہ ہے کہ ''صدر مرسی کو ترک صدر طیب اردوان کی حکمت عملی پر عمل پیرا ہونا چاہیے تھا،وہ ثابت کرتے کہ اپنی قوت بڑھانے سے زیادہ انہیں معاشی بحران کی فکر ہے''۔دوسرا خیال یہ ہے کہ مرسی کی یہی حکمت عملی بہتر تھی جو انہوں نے اپنا رکھی تھی۔دوسرے خیال کے حامل تجزیہ کاروں کی دلیل یہ ہے کہ ''ترکی اور مصر کے حالات مختلف ہیں،مختلف حالات کے تقاضے بھی مختلف ہوتے ہیں،ترکی میں طیب اردوان انتخابات کے نتیجے میں آئے تھے جبکہ مصر میں انقلاب آیا تھا،انقلاب کا تقاضا یہ تھا کہ پہلی فرصت میں سابق آمر کی باقیات کا صفایا کر دیا جاتا،یہی مرسی نے کیا

انتہا پسند کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

شام سے لے کر مصر تک خون کی جو لکیر کھینچ دی گئی ہے یہ در حقیقت جمہوریت پر ایک سوالیہ نشان ہے۔ مغرب نے جمہوریت کا تعارف ان الفاظ میں کروایا: Government of the People By the Poeple For the People یعنی "عوام کی حکومت، عوام ہی میں سے، عوام کے لیے"۔ جمہوریت کی اساس یہ ہے کہ طاقت کا سرچشمہ عوام ہوں گے۔ جسے عوام منتخب کرے وہ ریاست کی حقیقی قوت ہوگی۔ پارلیمنٹ عوام کا نمائندہ ادارہ ہوگا جہاں عوامی خواہشات اور امنگوں کے عین مطابق قانون سازی کی جائے گی۔ ریاست کے خدوخال کیا ہوں گے اس کا فیصلہ عوام کی ترجیحات کریں گی۔ جمہوریت کے اس اصول پر مغرب نے اتفاق کروالیا۔ لیکن ایک نظر سات پانیوں کے اس پار ڈالیں اور دوسری نظر اپنے گردوپیش پر، آپ پر واضح ہو جائے گا کہ جمہوریت کی حق کے پیچھے لگائی گئی دنیا تھک مرگئی مگر اس کے ہاتھ اب تک کچھ آنے نہیں دیا گیا۔ مغربی قوتوں کا دعوی یہ رہا کہ ہم جمہوریت کو فروغ دینا چاہتے ہیں اور رویہ ان کا یہ رہا کہ تیسری دنیا میں اپنے خیمے گاڑنے کے لیے غیر جمہوری قوتوں کو عوام پر مسلط کیے رکھا۔ پاکستان کی تاریخ تو آپ کے سامنے ہے۔ ایران، سعودیہ، مصر، شام، الجزائر، عرب امارات، ترکی، تیونس اور لیبیا کی تاریخ میں بھی جھانک کر دیکھیں تو وہاں بھی آمروں کی پشت پر یہی طاقتیں نظر آئیں گی۔ ہمیشہ اپنے کٹھ پتلی حکمرانوں کے ذریعہ صورت حال پیدا کی اور پھر صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے دوڑے دوڑے چلے آئے۔ آمروں کو بھی اس وقت تک سر پر بٹھائے رکھا جب تک ان کے مفادات پورے ہوتے رہے۔ جہاں اپنا کام پورا ہوا وہاں آمروں کو بھی جوتے کی نوک پر رکھ دیا اور سیاسی قوتوں کو گلے لگایا۔

مسلم دنیا کی سیاسی قوتوں کے ساتھ تو مغربی قوتوں کا معاملہ سیاسی ہی رہا۔ آئینی اور جمہوری راستے سے انہیں اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے ہی نہیں دیا گیا اور اگر پہنچ گئے تو ملک میں

اسے ووٹ کریں گے۔ ان شہریوں کو متاثر کرنے میں اردوان مکمل طور پر کامیاب رہے۔ اس کامیابی کے بعد بھی اردوان نے اول فوج پر نہیں بلکہ ریڈ شپ عدلیہ پر ہاتھ ڈالا۔ عدالتوں کو پہلے فوجی تسلط سے نکالا اور پھر انہی عدالتوں میں فوجی جرنیلوں کو لا کھڑا کیا۔ آج وہ جرنیل گھروں میں نہیں بلکہ جیلوں میں ہیں۔ اردوان کے اقدامات پر ترکی کی فوج اور سیکولر قوتیں بھی تململا اٹھی تھیں مگر اردوان کی "ٹائمنگ" کی وجہ سے وقت نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ ابھی کل ہی کی بات ہے کہ عالمی ذرائع ابلاغ اور بیرونی قوتوں کی ایما پر استنبول میں گیزی پارک کا ایشو بنا۔ ترکی میں طے شدہ سیاسی بحران کھڑا کیا گیا۔ مصر میں اگر سیکولر قوتیں تحریر اسکوائر کی طرف جا رہی تھیں تو ترکی میں وہی قوتیں تقسیم اسکوائر کی طرف جا رہی تھی۔ عالمی ذرائع ابلاغ اور بیرونی طاقتیں ترک سیکولر قوتوں کی بے تکان ہموائی کر رہی تھیں۔ اس ہموائی میں نیویارک ٹائمز اور اسرائیل ٹوڈے نے جو قائدانہ کردار ادا کیا وہ کوئی سربستہ راز نہیں ہے۔ مگر بھرپور طاقت رکھنے والے اردوان نے سیکولر قوتوں کے مطالبے پر گیزی پارک کھولنے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی سیکولر قوتوں کے اس کندھے میں فریکچر آ گیا جس پر بیرونی قوتوں نے بندوق رکھی ہوئی تھی۔ طویل خراش تراش کے بعد جو ایک ایشو مخالف قوتوں کے ہاتھ آیا تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اسے اردوان کی دانشمندانہ حکمت عملی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

بہتر ہوتا کہ اخوانی قیادت بھی حکومت ملنے کے بعد ان فلاحی سرگرمیوں کو وسعت دیتی جس کی بنیاد پر وہ اقتدار میں آئے تھی۔ قوت کے دائرے کو پھیلانے سے کہیں بہتر تھا کہ صدر مرسی عوام کے اس طبقے کی طرف توجہ دیتے جو دو انتہاؤں کے بیچ کھڑی تھی۔ جنہیں مذہب سے کوئی سروکار تھا اور نہ ہی سیکولرازم سے۔ عوام کے اسی طبقے کو متوجہ کرنے کے لیے تو انتخابی مہم چلائی جاتی ہے۔ رجسٹرڈ کارکن اور ہمدرد تو مطالبے کے بغیر بھی ووٹ دیتے ہیں۔ اگلی مدت وہی حکومت کنفرم کروا سکتی ہے جو اس طبقے کو مطمئن کر سکے۔ اس طبقے کی کوئی سیاسی گہرائی نہیں ہوتی مگر حالات کا جائزہ یہ بہت گہرائی سے لیتا ہے۔ اس کی حمایت اور مخالفت میں اعتماد کا پہلو نہیں ہوتا۔ اس کی محدود دنیا ہوتی ہے۔ اس کی ترجیحات ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ اس کے درد کا درماں ہونا چاہیے اب وہ لبرل کرے یا قدامت پسند۔ کیونکہ حکومتی کارکردگی ہی اس کے لیے معیار ہوتا ہے۔ اور یہ

سیاسی بحران کھڑا کر دیا۔ یہ بحران بھی ایسا کہ جس کے نتیجے میں وزیر اعظم کو گھر نہیں بلکہ جیل جانا پڑا۔ جیل سے بھی گھر کا راستہ کم ہی نصیب ہوا۔ جیل سے نکل کر پھانسی کے تختے پر جاؤ یا قومی سیاست سے بے دخل ہو کر ملک سے نکلو۔ یہ طے کیا جا چکا کہ جمہوری راستہ وہ نہیں ہوگا جس پر تم اپنی مرضی سے چلو، راستہ وہی ہوگا جس کی نشاندہی ہم کریں گے۔ سو بیٹھ کر معاملات کو عزت سے این آر او کرو اور اپنی حکومت کنفرم کروالو۔ اقتدار میں آنے کے بعد عالمی سیاسی طاقتوں اور مالیاتی اداروں کی دی ہوئی سمت پر اگر حکومت چلی تو بہت بہتر ورنہ بوریا بستر گول۔ ان قوتوں کا بس چلے تو پاکستان جیسے ملک میں سیاسی قوتوں کو ہمیشہ کے لیے دفنا کر رکھ دیں مگر ایک حوالے سے یہ سیاسی قوتیں ان طاقتوں کے لیے پلان بی کی حیثیت سے قابل قبول رہی ہیں۔ وہ یہ کہ ہماری سیاسی جماعتیں لمیٹڈ کمپنیاں ہیں۔ یہ خاندانوں کی جاگیر ہیں۔ یہ جماعتیں سیاسی ضرور ہیں مگر جمہوری ہرگز نہیں ہیں۔ فیصلہ کن حیثیت ان جماعتوں میں انھی کی رہی جن کے نام جماعتیں رجسٹرڈ ہیں۔ یہ جماعتیں اقتدار میں آتی ہیں تو ان کا طرز عمل مکمل طور پر نہ سہی مگر قریب قریب آمرانہ ہوتا ہے۔ عالمی طاقتوں کے لیے آمر اسی لیے آنکھ کا تارا ہوتا ہے کہ وہ ان طاقتوں کے لیے کوئک ریسپانس فورس کا کردار ادا کرتا ہے۔ آمرانہ طرز کی وجہ سے سیاسی جماعتیں بھی ان طاقتوں کی یہ ضرورت پوری کر دیتی ہیں۔ اگر کوئی خلل پڑے تو چلتا کرنے میں ٹائم بھی نہیں لگتا۔ ہر چند کہ سیاسی قوتوں کے ساتھ عالمی طاقتوں کا رومانس دیرپا اور پائیدار نہیں مگر خوش نصیبی کو اتنا بھی بہت ہے کہ کسی نہ کسی درجے میں ان کے ستارے بیرونی طاقتوں سے ملتے ہیں۔ معاملہ مگر ان کے لیے خراب ہے جو مذہب کی شناخت کے ساتھ ریاست میں جینا چاہتے ہیں۔

اب تک کی حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت کی دستاویز میں مذہب کا کوئی خانہ رکھا ہی نہیں گیا۔ یہ درست ہے کہ ریاست کے ساتھ مذہب کا کوئی تعلق نہیں مگر یہ کیسے مان لیا جائے کہ ریاست کے ساتھ اہل مذہب کا بھی کوئی تعلق نہیں۔ کسی سے اس کا نظریہ چھینا نہیں جا سکتا اور یہ کہ اپنی سوچ کسی پر مسلط نہیں کی جا سکتی۔ جمہوریت کے دیے ہوئے اصول حکمرانی کے مطابق اقتدار کی زمام اس ہاتھ میں ہوگی جس کی پشت پر عوام کی طاقت ہوگی۔ شہریوں کی ترجیحات ہی ارباب اختیار کے لیے محور کا درجہ رکھیں گی۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اگر کوئی جماعت مذہبی ترجیحات کو لے کر عوامی قوت

کے ساتھ آئینی راستے سے ہوتے ہوئے ایوان اقتدار میں پہنچ جائے تو پورا مغرب تلملا اٹھتا ہے۔ عالمی میڈیا تیزی کے ساتھ زہر اگلنا شروع کر دیتا ہے۔ خزانے کا منہ کھول کر حزب اختلاف اور فوج کی پشت پناہی شروع کر دی جاتی ہے۔ دقیانوس انتہا پسند دہشت گرد جیسی اصلاحات تھوپ دی جاتی ہیں۔ خود اونٹ نگلنے والے آگے بڑھ کر مکھی چھاننا شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان کا خون پی کر ایک ٹانگ پر ناچے، آنکھیں پھیر لی جاتی ہیں مگر اہل مذہب کی نمائندہ قوتوں پر پانی بھی حرام کر دیا جاتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اہل مذہب اس دنیا کی حقیقت نہیں ہیں؟ کیا ان کی کوئی ترجیحات نہیں ہیں؟ اگر انہیں اکثریت حاصل ہو تو کیا اپنی ترجیحات اور روایات پر انہیں جینے کا حق حاصل نہیں ہے؟ ایک بات بتائیں۔ زمین آپ کی ہو اور گھر بھی آپ کا۔ آپ باشعور بھی ہیں اور تجربہ کار بھی مگر آپ ہی کے گھر آپ کو اجنبی کر دیا جائے۔ آپ نے کیا کھانا ہے اور کیا پینا ہے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار آپ سے چھین لیا جائے۔ آپ کونسی کروٹ ٹھیک اور کون سی غلط ہے یہ کوئی تیسرا شخص بتائے۔ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک کونے میں بٹھا دیا جائے۔ روکھی سوکھی کھا کر شکر ادا کرنے کی تلقین کی جائے۔ آپ کیا کریں گے؟ آپ تیورائیں گے۔ آپ بات کریں گے۔ مگر بات کرنے پر بھی ایک زنانے دار طمانچہ آپ کو رسید کر دیا جائے۔ آپ روئیں تو آپ کو نکی اور پاگل قرار دے دیا جائے۔ آپ چیخیں اور چلائیں تو آپ کو دہشت گرد کہہ دیا جائے۔ اس جبر سے نمٹنے کے لیے آپ تھانے جائیں مگر وہاں رکھوالے بھی متوالے کے ساتھی بن جائیں۔ آپ کورٹ جائیں اور منصف آپ کو قانون کے بکھیڑوں میں الجھا کر قابض کے ساتھ معاملات طے کرنے بیٹھ جائے۔ آپ اخبار کے دفتر جائیں مگر لینڈ مافیا کی کمائی پر پلنے والا اخبار نویس مخبری کے فرائض انجام دینے لگ جائے۔ سارے راستے بند ہو جانے پر آپ کے پاس ایک راستہ بچ جائے اور وہ یہ کہ آپ بیچ چوراہے پر کھڑے ہو کر احتجاج کرنے لگ جائیں۔ چیخیں اور چلائیں۔ مگر آپ کو نقص امن کا ذمہ دار قرار دے کر جیل میں پھینک دیا جائے۔ عدالت سے لے کر صحافت تک سبھی جھوٹ پر متفق ہو جائیں۔ مفتی کا فتویٰ بھی سیاہ کو سفید کرنے کے دھندے میں پڑ جائے؟ اب کیا کریں گے؟ کس دیوار سے سر ماریں گے؟ دو ہی راستے بچتے ہیں۔ خودکشی یا پھر خودکش حملہ۔ انتقام کے سوا کوئی راستہ ہو تو بتا دیجیے۔ بغاوت کے سوا کوئی حل ہو تو

راہنمائی کیجیے۔ یہ دو ایسے راستے ہیں جو کبھی خوشی سے اختیار نہیں کیے جاتے۔ حالات کی بے رحمی انسان کو اس راستے کے انتخاب پر مجبور کرتے ہیں۔ بغاوت کا راستہ آخری حل ہوتا ہے جس کو اختیار کرنے کے لیے باغی جمہوریت کے کسی اصول اور مفتی کے کسی فتوے کا پابند نہیں ہوتا۔ مصر ،تیونس ،الجزائر، لیبیا، ترکی ،شام ،پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک کا معاملہ یہی ہے۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں مذہبی روایات کے ساتھ رہنے والے مسلمان اکثریت میں ہیں۔ انھی روایات کے ساتھ وہ جینا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے وہ پرامن جدوجہد کرتے ہیں۔ اقتدار کے ایوان میں پہنچنے کے لیے وہ جمہوریت ہی کے اصول Government of the People By the people For the people کو اختیار کرتے ہیں۔ وہ ایک نظریے اور سوچ کی ترویج کرتے ہیں۔ اس کے لیے رائے عامہ ہموار کرتے ہیں۔ عوام میں اپنی حمایت پیدا کرتے ہیں۔ عوام کی قوت سے وہ منتخب ہوتے ہیں۔ وہ ایوان میں آکر انھی خطوط پر پالیسی بناتے ہیں جن کا انہوں نے عوام سے وعدہ کیا ہوتا ہے۔ وعدہ یہ ہوتا ہے کہ حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہوگی۔ یہ ایک خالص آئینی اور جمہوری طرزِ عمل ہے۔ اس طرزِ عمل پر بھی مغرب کے پیٹ میں قیامت کا مروڑ اٹھتا ہے۔ وہ سازشوں کے جال پھیلا دیتا ہے۔ خون ریز معرکوں سے بھی وہ دریغ نہیں کرتا۔ آٹھ لوگوں کو مخالفت میں کھڑا کر کے "عوام کے لیے عوام ہی کی قائم کردہ حکومت" کی بساط لپیٹ دیتا ہے۔ سوال کیجیے تو جواب میں کہتا ہے کہ اس حکومت کو عوام کی خواہشات پر ہٹایا گیا۔ اچھا؟ تو پھر یہ بھی بتلا دیں کہ یہ حکومت قائم کس کی خواہش پر ہوئی تھی؟ اس سوال کا جواب تشدد، ملک بدری، جیلوں، ہتھکڑیوں اور پھانسیوں کی صورت میں ملتا ہے۔ خالص آئینی جدوجہد کے لیے اگر پرامن انداز میں بھی آواز اٹھائی جائے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ اسٹیٹ کی رٹ کو چیلنج کر دیا گیا ہے۔ لاشوں کے انبار لگ جاتے ہیں۔ میڈیا خرید لیا جاتا ہے۔ مالیاتی ادارے بلیک میلنگ شروع کر دیتے ہیں۔ زر خرید غلام آگے بڑھ کر اپنا کندھا پیش کر دیتے ہیں۔ اقوام متحدہ کے چیپٹر لہرائے جاتے ہیں۔ عالمی معاہدات دکھائے جاتے ہیں۔ انسانی حقوق کے چیمپئن انسانوں کے ہی حقوق چھین لیتے ہیں۔ پھر خبر ہے کیا ہوتا ہے؟ پھر محروموں کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ سانس پھولنے لگتی ہے۔ اعصاب شل ہو جاتے ہیں۔ دماغ میں بغاوت انگڑائیاں لیتی ہے۔ سینے میں انتقام کی آگ

دہک اٹھتی ہے۔ صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے۔ حواس بے قابو ہو جاتے ہیں۔ برداشت جواب دے جاتی ہے۔ یہ سارے فطری جذبات جس سانچے میں ڈھل کر نتائج کے طور پر سامنے آتے ہیں، اس کو اگر کوئی نام دیا جائے تو وہ سات حروف پر مشتمل ایک نام ہو سکتا ہے۔ صرف سات حروف۔ ''القاعدہ''۔ سات نہیں، صرف چھ حروف۔ ''طالبان''۔ چھ بھی نہیں، صرف پانچ حروف۔ ''خودکش''۔ آفرین ہے کہ دنیا پھر بھی پوچھتی ہے کہ یہ انتہا پسند کہاں کیسے پیدا ہوتے ہیں؟

کیسے؟

مغرب نے جمہوریت کا تعارف جن الفاظ میں کروایا وہ الفاظ مکرر عرض ہیں :
Government of the People By the People For the People-یعنی عوام کی حکومت، عوام ہی میں سے، عوام کے لیے۔ مختصر الفاظ میں جمہوریت کی بنیاد عوام کی طاقت پر قائم ہے۔ مگر جمہوریت کا راگ الاپنے والے مغرب اور مغرب زدہ لبرل قیادت نے مسلم دنیا میں اس اصول کو ثمو پذیر ہونے نہیں دیا۔ غیر جمہوری ہتھکنڈوں سے جمہوری قوتوں کا راستہ روکنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتہا پسندی اور شدت پسندی نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مگر کیسے؟ آیئے اس ''کیسے'' کا جواب ڈھونڈتے ہیں۔

الجزائر ایک اسلامی ملک ہے۔ آزاد ہوتے ہی نیشنل لبریشن فرنٹ سیاہ و سفید کی مالک بن گئی۔ ملک تو آزاد ہو گیا مگر قوم یرغمال ہو گئی۔ سوچنے، بولنے اور کرنے پر پابندی۔ انسانی حقوق تقریباً معطل۔ 1980 میں الجزائری نوجوانوں کے دو گروپ سامنے آگئے۔ بلکہ آمنے سامنے آگئے۔ ایک طرف کمیونسٹ تھے دوسری طرف اسلامسٹ۔ نظریاتی کشمکش کا آغاز ہو گیا۔ اسلامسٹوں کے معروف لیڈر علی بن حاج تھے۔ علی بن حاج عوام میں گئے اور ان کے سامنے اسلام کو ایک نظام کے طور پر پیش کیا۔ علی بن حاج باکردار انسان تھے۔ گفتگو میں سحر اور شخصیت میں جاذبیت۔ انہوں نے بات سمجھائی اور لوگوں نے بات سمجھ لی۔ رائے عامہ انہوں نے ہموار کر لی۔ 80 کی دہائی میں الجزائری نوجوانوں نے ایک جماعتی نظام ختم کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ احتجاج کی تاب نہ لاتے ہوئے نومبر 1988 میں کثیر الجماعتی سیاست کی اجازت دے دی گئی۔ اگلے ہی برس علی بن حاج نے الجزائر یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر عباس مدنی کے ساتھ مل کر اپنی جماعت ''اسلامک سالویشن فرنٹ'' کی بنیاد رکھ دی۔ 12 جون 1990 میں الجزائر میں بلدیاتی انتخابات ہوئے۔ اسلامک سالویشن فرنٹ نے عوام کی قوت سے 93 فیصد شہروں اور قصبوں میں

اپنی اکثریت ثابت کردی۔ مغرب زدہ لبرلز کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ دسمبر 1991 میں عام انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ اسلامک سالویشن فرنٹ نے عوام کی طاقت سے انتخابات کے پہلے مرحلے میں جھاڑو پھیر دی۔ صفایا کر دیا۔ لبرلز کے کان کھڑے ہو گئے۔ کمزور دل جمہوریت جلد دم توڑ گئی۔ لبرلز قوتوں کی ایما پر فوج آگے بڑھی اور انتخابات کا دوسرا مرحلہ منسوخ کر دیا گیا۔ مذہب کی بنیاد پر بننے والی ہر جماعت کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ سوال ہے کہ کیوں؟ وہ عوام کے لیے آئے تھے، عوام ہی میں سے تھے اور عوام نے ہی منتخب کیا تھا۔ اگر لبرلز منتخب ہو جاتے تو؟ کیا تب بھی یہی کچھ کیا جاتا؟

جمہوریہ ترکی کی تاریخ دیکھ لیں۔ 1932 میں وجود میں آنے والے اس ملک کا پہلا صدر مصطفیٰ کمال اتاترک مقرر ہوا۔ جمہوریت کا بخار تھا اور جمہوریت پہ ہی نزلہ اتار دیا۔ ترکی ایک اسلامی ملک تھا۔ مگر سیکولر راہنما مصطفیٰ کمال اتاترک نے مذہب پر وہ غضب ڈھایا کہ ناانصافی کے اگلے پچھلے ریکارڈ برابر ہو گئے۔ ٹوپی عمامے داڑھی اور حجاب پر پابندی عائد کر دی۔ عمرے اور حج کے سفر پر پابندی لگا دی۔ ترکی زبان سے عربی کے الفاظ نکال دیے۔ عربی زبان میں اذان دینے پر سزا مقرر کر دی۔ قدیم دینی درس گاہوں کو سیکولرز کی پناہ گاہوں میں بدل دیا۔ غرضیکہ مذہب کی وہ آزادی سلب ہو کر رہ گئی جسے جمہوریت انسانیت کا بنیادی حق بتاتی ہے۔ ترکی کے مسلمانوں کو چاہیے تھا کہ وہ تشدد کا راستہ اختیار کرتے۔ ایسا مگر انہوں نے نہیں کیا۔ انہوں نے آئینی اور جمہوری راستے کا انتخاب کیا۔ عدنان میندریس اور جلال بایار آگے بڑھے۔ عوام سے رابطہ کیا۔ رائے عامہ کو متاثر کیا۔ الجزائر کی طرح یہاں بھی ایک جماعتی نظام رائج تھا۔ عوام کے دباؤ پر پارلیمنٹ نے کثیر الجماعتی سیاست کی اجازت دے دی۔ عدنان میندریس نے 1946 میں "ڈیموکریٹک پارٹی" کی بنیاد رکھ دی۔ 1950 میں عام انتخابات کا اعلان ہو گیا۔ عوام نے رائے دہی کا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے ڈیموکریٹک پارٹی کو دو تہائی اکثریت سے جتوا دیا۔ سیکولرز کی نمائندہ جماعت ریپبلکن پیپلز پارٹی کو صرف اور صرف 59 نشستیں ملیں۔ مغرب زدہ لبرلز تلملا اٹھے مگر کیا کرتے۔ عوام کے اس فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ مصطفیٰ کمال اور اس کی غیر جمہوری سوچ کے لیے ترکی میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ عدنان میندریس وزیر اعظم اور جلال بایار صدر منتخب ہو گئے۔ پہلی حکومتی

مدت کامیابی سے گزر گئی۔ اس مدت میں عدنان میندریس نے مسلم اکثریت کا احترام کرتے ہوئے ٹوپی داڑھی اور حجاب پر سے پابندی اٹھا دی۔ مسلمان حج و عمرے کی ادائیگی میں آزاد ہو گئے۔ عربی اذان کی اجازت مل گئی۔ معاشی ترقی اس قدر مثالی ہوئی کہ اس دور کو "انقلاب سفید" کے نام سے جانا گیا۔ عدنان میندریس کو ترکی میں جمہوریت کا معمار اول قرار دیا گیا۔ اسی کارکردگی کی بنیاد پر 1957 کے عام انتخابات میں بھی ڈیموکریٹک پارٹی نے حریف طاقتوں کو چکرا کر رکھ دیا۔ یاد رہے کہ اس انتخابات میں ریپبلکن پیپلز پارٹی نے ترکی کی تاریخ کی سب سے بڑی دھاندلی کی۔ اس کے باوجود عدنان اور جلال پھر سے برسر اقتدار آ گئے۔ ترقی کی وہی رفتار۔ انصاف کے وہی پیمانے۔ وہی طور وہی طریقے۔ سب معاملات درست سمت میں جا رہے تھے۔ مگر آئے روز عدنان میندریس کی مقبولیت کے چڑھتے ہوئے گراف سے لبرل انتہا پسندوں کی سانسیں چڑھنے لگیں۔ قریب پھٹنے کو تھے کہ عوام نے تو مسترد کر دیا تھا۔ اب کوئی غیر آئینی راستے سے ہی ایوانوں میں پہنچا جا سکتا تھا۔ سو ریپبلکن پیپلز پارٹی نے فوج کو اکسایا اور جنرل جمال گرسل نے عدنان میندریس کا تختہ الٹ دیا۔ حالانکہ عدنان میندریس اپنی ذات میں اسلامسٹ نہیں تھا۔ وہ ایک جمہوریت پسند راہنما تھا۔ یہ ضرور تھا کہ اسلامسٹوں نے عدنان میندریس کو حقیقی جمہوریت پسند لیڈر قرار دیا مگر ڈیموکریٹک پارٹی ان کے لیے خالص مذہبی جماعت نہیں تھی۔ اہل مذہب کا شاید میندریس کی طرف میلان بھی سزا کے لیے بہت تھا۔ اسی لیے عوام کے فیصلے کو مسترد کر دیا گیا۔ صرف یہی نہیں، ڈیموکریٹک پارٹی کو توڑ کر تمام مرکزی راہنماؤں پر سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ عدنان میندریس پر آئین کی خلاف ورزی کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ عدنان میندریس کو ساتھیوں سمیت راتوں رات سولی چڑھا دیا گیا اور جلال بایار کو عمر قید کی سزا سنا دی گئی۔ سوال ہے کہ کیوں؟ وہ عوام کے لیے آئے تھے، عوام ہی میں سے تھے اور عوام نے ہی منتخب کیا تھا۔ اگر لبرلز منتخب ہو جاتے تو؟ کیا تب بھی یہی کچھ کیا جاتا؟

ترکی کے جمہوریت پسند اسلامسٹوں کو مسلح ہو کر سڑکوں پر آ جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے جمہوری راستے کا ہی انتخاب کیا۔ نیا لیڈر اور نئی جماعت آ گئی۔ اب خالص مذہبی سوچ رکھنے والے نجم الدین اربکان کا دور شروع ہوا۔ شاید یہ ترکی کی عوام کا ایک شدید انتقام تھا جو وہ

جمہوری اور آئینی طریقے سے لینا چاہتے تھے۔ نجم الدین اربکان نے عوام سے ہی رابطہ کیا۔ مذہب اور ریاست کی ہم آہنگی پر رائے عامہ ہموار کی۔ ترکی کی عوام نے اربکان کی سوچ کو قبول کرلیا۔ اب یہ سوچ ریاست پر مسلط نہیں کی گئی بلکہ آئینی طور پر ایک سیاسی جماعت ''نیشنل والس پارٹی'' کی بنیاد رکھی گئی۔ جماعت کے ہاتھ میں اسلحہ تھا اور نہ ہی زبان پر انگارے۔ خلاف آئین تھے اور نہ ہی خلاف جمہوریت۔ مگر اگلے برس ہی جماعت کالعدم قرار دے دی گئی۔ تشدد کے بجائے اربکان نے ''نیشنل سالویشن پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی۔ جماعت قوم پر مسلط نہیں ہوئی بلکہ عام انتخابات میں گئی۔ 72 میں جماعت قائم ہوئی اور 73 میں انتخابات کا طبل بج گیا۔ نیشنل سالویشن پارٹی نے انتخابات میں حصہ لیا اور 48 نشستیں حاصل کر کے ثابت کر دیا کہ ترک عوام کیا چاہتی ہے۔ اربکان ایوان میں پہنچے اور نائب وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ بہترین کارکردگی کا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے 77 کے انتخابی معرکے میں اترے۔ انتخابات میں حصہ لیا اور تیسری بڑی قوت بن کر سامنے آ گئے۔ مینڈریس کی طرح اربکان کی مقبولیت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ جماعت کے نمائندوں نے سادہ زندگی اور بہترین کارکردگی کی مثال قائم کر دی۔ نہ دہشت گردی نہ خلاف ورزی۔ نہ حکم عدولی نہ انحراف۔ اس کے باوجود سیکولر فوج اور اس کی حامی جماعت نے مل کر نیشنل والس پارٹی کو توڑنے کا اعلان کر دیا۔ دوسری آئینی جماعت کالعدم قرار دے دی گئی۔ نجم الدین اربکان کو ساتھیوں سمیت جیل میں ڈال دیا گیا۔ سات برس کے بعد 87 میں ایک ریفرنڈم کے نتیجے میں یہ پابندی ختم ہوئی۔ اربکان پھر تشدد کی طرف نہیں گئے۔ نئی سیاسی جماعت ''رفاہ پارٹی'' کی بنیاد رکھ دی۔ 1990 کے انتخابات میں گئے اور چالیس نشستیں حاصل کرلیں۔ بے مثال کارکردگی کے ساتھ پھر 1995 کے انتخابات میں گئے اور اکیس فیصد نشستیں حاصل کرلیں۔ ریپبلکن پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت بنائی۔ ایوان نمائندگان کے ووٹ سے اربکان ترکی کے وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ این سعادت بزور بازو نیست والی بات ہوئی۔ یہ منصب عوام کی حمایت سے حاصل کیا گیا۔ برسوں بعد حبس اور گھٹن کا ماحول ختم ہوا۔ انسانی حقوق ٹھیک معنوں میں بحال ہو گئے۔ ترک عوام کی زندگی کا معیار بلند ہونے لگا۔ ایک ''جرم'' سرزد ہو گیا۔ جرم یہ کہ خارجہ پالیسی کا محور بدل دیا۔ مغربی بلاگ سے ترکی سرکنے لگا۔ خطے

کے ممالک سے تعلق بحال کیا گیا۔ اسلامی ممالک کے معاشی مسائل کے حل کے لیے ڈی ایٹ نامی تنظیم قائم کر لی گئی۔ اسرائیل کو بیک فٹ پر دھکیل دیا۔ یہ سب عوام کی خواہشات پر کیا۔ کیونکہ عوام نے ہی تو منتخب کیا تھا۔ مگر عوام کے فیصلے کو "جمہوریت پسندوں" نے تسلیم نہیں کیا۔ 1997 میں سیکولر فوج نے رفاہ پارٹی کی منتخب حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ پارٹی ایک بار پھر کالعدم قرار دے دی گئی اور اربکان کو ساتھیوں سمیت سیاست سے بے دخل کر دیا گیا۔ اب تو تشدد کی طرف آ جانا چاہیے تھا۔ اسلام پسندوں نے مگر پھر آئینی جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ اربکان نے فضیلت پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ سوال لیکن یہ ہے کہ اسلامسٹوں کا آئینی راستہ کیوں روکا گیا؟ کیوں؟ وہ عوام کے لیے آئے تھے، عوام ہی میں سے تھے اور عوام نے ہی منتخب کیا تھا۔ اگر لبرلز منتخب ہو جاتے تو؟ کیا تب بھی یہی کچھ کیا جاتا؟

ترکی کے مسلمان رنجیدہ تھے۔ وہ یقیناً انتقام لینا چاہتے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ آئین کی رٹ اور جمہوریت کا راگ ایک ڈھکوسلے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ راستے شاید ان لوگوں کے لیے بنائے گئے ہیں جو خود تو داخلی ہوں مگر ایجنڈا خارجی ہو۔ اس تلخ تجربے کے بعد اسلامسٹ دل گرفتہ تھے۔ انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔ ان کے جذبات کی ترجمانی کے لیے کچھ لوگ اربکان کی سعادت پارٹی سے الگ ہو گئے۔ وہ آگے بڑھے اور انتقام کی دہکتی ہوئی آگ پر قابو پالیا۔ وہ لوگ طیب اردگان، عبداللہ گل اور ان کے ساتھی تھے۔ بغاوت کا راستہ انہوں نے منتخب نہیں کیا۔ سیاسی جماعت جسٹس اینڈ ڈیولپمنٹ پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ عوام میں گئے اور مقبول ہو گئے۔ نوجوان قطار اندر قطار جماعت سے وابستہ ہو گئے۔ مشتعل اسلامسٹوں کے بپھرے ہوئے جذبات کو جماعت نے خود میں جذب کر لیا۔ انہیں ایک نئی سمت دی۔ پھر انتخابات کا انتظار کیا کہ عوام کیا فیصلہ کرتے ہیں۔ 2002 میں عام انتخابات ہوئے اور اردگان کو دو تہائی اکثریت مل گئی۔ اردگان وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ عوامی امنگوں پر اپنی پالیسیاں تشکیل دیں۔ معاشی ترقی کی ریکارڈ رفتار نے طیب اردگان کو ترکی کی دھڑکنوں میں بسا دیا۔ اس دوران نام نہاد جمہوریت پسندوں نے کئی سازشیں کیں سب غارت گئیں۔ ترکی کی ترقی کے ساتھ اردگان 2007 کے انتخابات میں اترے اور عوام نے بھاری اکثریت کے ساتھ پھر ایوان میں پہنچا دیا۔ مطلب یہ ہوا کہ عوام نے جسے پانچ

برس قبل منتخب کیا وہ عوامی امنگوں پر پورا اتر کر دوبارہ عوام کی طاقت سے منتخب ہو گیا۔ اسے کہتے ہیں Government of the People By the People For the People۔ اردگان دوبارہ وزیر اعظم منتخب ہو گئے۔ معاشی ترقی کی رفتار دگنی ہو گئی۔ قرضوں کا بوجھ اترنے لگا۔ خوشحالی آ گئی۔ تعلیم اور انصاف مفت ہو گئے۔ روزگار مل گیا۔ انہی کامیابیوں کے ساتھ اردگان کی پارٹی 2011 کے انتخابات میں اتری اور تیسری بار دو تہائی اکثریت کے ساتھ ایوان میں پہنچ گئی۔ عوام کی حکومت، عوام ہی میں سے، عوام کے لیے۔ تیسرے دور میں بیرونی قرضوں کی آخری قسط ادا ہو گئی۔ فی کس آمدنی دو فیصد سے اوپر چلی گئی۔ ترکی دس بڑی معیشتوں کی صف میں کھڑا ہو گیا۔ لیکن ایک ''جرم'' ہو گیا۔ خارجہ پالیسی کا رخ عوامی امنگوں کی طرف کر دیا۔ یورپی یونین کونسل کی بلیک میلنگ کو مسترد کر دیا۔ اسرائیل کو اپنی اوقات میں لا کھڑا کیا۔ عالم اسلام کے درد کو اپنا درد بنا لیا۔ سب ''عوام کے لیے'' کیا۔ عالمی طاقتوں نے عوام کی اس قوت کو کچلنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہودی لابی سیکولر قوتوں کا گٹھ جوڑ قائم ہو گیا۔ تقسیم اسکوائر پر کرائے کے مظاہرین کھڑے کر دیے۔ ڈیلی ٹائمز اور اسرائیل ٹوڈے نے ترجمانی شروع کر دی۔ گیزی پارک کو غازی پارک بنا دیا۔ تعمیری منصوبے کو کفر اسلام کی جنگ سے تعبیر کیا۔ کوشش یہ تھی کہ تقسیم اسکوائر بھی اردگان کے لیے تحریر اسکوائر ثابت ہو جائے مگر اردگان نے اول عوامی قوت کا مظاہرہ کیا اور پھر افہام و تفہیم سے تقسیم سکوائر کو نمٹا دیا۔ اردگان کے نوجوان آپے سے باہر آ چکے تھے۔ انتقام کے لیے بے تاب۔ جواب کے لیے تیار۔ مگر ان کے جذبات کو آئینی جدوجہد کی طرف موڑ دیا اور اس جنگ کا فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا۔ عوام فیصلہ کریں اپنے ووٹ کے ذریعے۔ اگر تقسیم اسکوائر بھی تحریر سکوائر ثابت ہو جاتا تو عوام کی حکومت، جو عوام کے لیے عوام ہی کے ذریعے قائم ہوئی، کا خاتمہ ہو جاتا۔ جن جرنیلوں کو بمشکل بیرکوں میں محدود کر دیا گیا ہے وہ پھر سے اقتدار میں ہوتے۔ مگر کیا ایک آئینی طریقہ ہوتا؟ ایک جمہوری طرز عمل ہوتا؟

مصر کی طرف آئیں۔ مصر بھی ایک اسلامی ملک ہے۔ انبیا کی سرزمین ہے۔ شاہ فاروق کا سورج غروب ہو رہا تھا تو امام حسن البنا کا ستارہ سیاست کی افق پر طلوع ہو رہا تھا۔ حسن البنا نے کہیں اور نہیں، عوام ہی سے رابطہ کیا۔ اپنی سوچ ان کے سامنے رکھی۔ عوام نے یہ قبول کر لی۔ شیخ

بناء نے اخوان المسلمون کی بنیاد رکھ دی۔ آغاز پر ہی رجسٹرڈ اخوانیوں کی تعداد پانچ لاکھ ہوگئی۔ اخوان کی حمایت سے ہی جمال عبدالناصر کا انقلاب کامیابی سے ہمکنار ہوا۔ جمال عبدالناصر مصر کا ہیرو تھا۔ یہ ہیرو بعد میں بے راہ روی کا شکار ہوگیا۔ اپنے راستے سے ہٹتے ہی اخوان نے جمال عبدالناصر کی پالیسیوں سے اختلاف شروع کر دیا۔ وہی سزا ملی جو جمہوریت پسند اسلامسٹوں کے لیے طے کی جاچکی ہے۔ اخوان المسلمون کو کالعدم قرار دے دیا گیا۔ جمال عبدالناصر کے بعد انوار السادات آیا اور اس کے بعد حسنی مبارک۔ اس پورے عرصے میں اخوانیوں کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ اخوانی کبھی مسلح نظر نہیں آئیں گے۔ درخت کے ٹوٹے ہوئے ایک پتے کا الزام بھی ان کے سر ڈالنا مشکل ہے۔ آئین سے انحراف نہیں کیا۔ جمہوری روایت کا ہی احترام کیا۔ مگر ایک ''جرم'' کیا۔ سیاہ کو سفید نہیں کہا۔ اسرائیل کے وجود کو برداشت نہیں کیا۔ فلسطینی مزاحمت کاروں کی حمایت کی۔ جو کیا آئین کی حدود میں کیا۔ مگر جمہوریت پسندی کی سزا دی گئی۔ جماعت پر پابندی لگ گئی۔ ایک وقت میں پچاس ہزار اخوانی جیلوں میں ڈال دیے گئے۔ حسن البنا کو قاہرہ کی سڑکوں پر قتل کر دیا گیا۔ مرشد عام حسن الھضیبی کو عمر قید ہوئی۔ جیل میں ہی وہ دم توڑ گئے۔ چھ مرکزی قائدین کو راتوں رات سولی چڑھا دیا گیا۔ لاکھوں اخوانی ملک بدر کر دیے گئے۔ دفاتر سیل ہوگئے۔ جرائد و رسائل قبضے میں لے لیے گئے۔ چالیس برس حسنی مبارک مسلط رہا۔ اپنے کام سے زیادہ وہ اخوانیوں پر سوار رہا۔ اخوانی انقلاب کا نعرہ لگا کر اٹھ گئے۔ یہ انقلاب خونی بھی ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے تحریر اسکوائر پر ڈیرے ڈال دیے۔ ہاتھوں میں پلے کارڈز کے سوا کچھ نہ تھا۔ خالی ہاتھ فوج کا مقابلہ کیا اور جابر کا تخت الٹ دیا۔ یہ خالص ترین عوامی قوت کا مظاہرہ تھا۔ قوت کے اس اظہار کے بعد اخوانی ایوان اقتدار پر قابض نہیں ہوئے۔ قوم پر مسلط نہیں ہوئے۔ وہ جمہوریت پر یقین رکھتے ہیں۔ تب ہی تو انتخابات کا مطالبہ کیا۔ حسنی مبارک کی فوج اور عدلیہ کے بیچ انتخابات ہوئے، مگر اخوانیوں نے اپنی برتری ثابت کر دی۔ صدر مرسی 62 فیصد کی حمایت کے ساتھ قائد ایوان منتخب ہوئے۔ مطالعہ کریں قدم قدم پر جمہوریت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہاں ایک ''جرم'' ملے گا۔ رفح کراسنگ کھول دی گئی جس سے فلسطین کا اقتصادی گھیراؤ ختم ہوگیا۔ مرسی نے اسرائیل کو بیچی جانے والی گیس کا مارکیٹ ریٹ

مانگ لیا۔ کیوں؟ کیونکہ یہ عوام کا حق تھا جو وہ مانگ رہے تھے۔ جمہوریت کا تقاضہ تھا کہ مرسی یہ جنگ لڑتا۔ آئینی طریقے سے۔ جمہوری انداز میں۔ مگر عالمی طاقتیں اور اس کے ذرائع ابلاغ ایک پیج پر آگئے۔ تقسیم سکوائر کی طرح یہاں بھی مٹھی بھر لبرلز جمع کردیے گئے۔ وہ لبرلز جنہوں نے تحریر سکوائر پر دو دن میں ۹۱ خواتین کا ریپ کیا۔ اسرائیل کی ایما پر جنرل سیسی نے اخوان کا اقتدار لپیٹ دیا۔ مرسی اب تک قید ہیں۔ اخوانی قیادت جیل میں ہے۔ قائدین کے بچے قتل کردیے گئے۔ ڈیڑھ ماہ سے اخوانی سڑکوں پر ہیں۔ اب تک چھ ہزار سے زائد نہتے اخوانیوں کو بے دردی سے قتل کردیا گیا ہے۔ مسجدیں جلادی گئی ہیں۔ یہ سلسلہ زوروں پر ہے۔ عالمی ذرائع ابلاغ، حسنی مبارک کا مفتی اعظم، امریکہ کا اتحادی سعودیہ، خلیفہ کیر قطر اور عرب امارات بے تکان جنرل سیسی کے اقدامات کو ٹھیک ثابت کررہے ہیں۔ مگر کیوں؟ وہ تو عوام کے لیے آئے تھے، عوام ہی میں سے تھے اور عوام نے ہی منتخب کیا تھا۔ اگر لبرلز منتخب ہوجاتے تو؟ کیا تب بھی یہی کچھ کیا جاتا؟

اب پاکستان کی طرف آئیں۔ پاکستان یہ رہا آپ کے سامنے۔ دو قومی نظریے کی بنیاد پر یہ حاصل کیا گیا۔ لا الہ الا اللہ کا نعرہ دیا گیا۔ اسلامی فلاحی ریاست کا ٹائٹل دیا گیا۔ خود قائداعظم نے قرآن وسنت کو آئین قرار دیا۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ہندوستان چھوڑ دیا۔ خاندان کے خاندان ستلج میں بہہ گئے۔ راوی سرخ ہوگیا۔ خاندان اجڑ گئے۔ گودیں ویران ہوگئیں۔ بچے یتیم ہوگئے۔ سہاگ اجڑ گئے۔ کاروبار برباد ہوگئے۔ صرف اس لیے کہ ایک اسلامی فلاحی ریاست قائم ہونے جارہی ہے۔ پھر ہوا کیا؟ ہوا کچھ یوں کہ قائداعظم کی جیب میں کھوٹے سکے کھنکنے لگے۔ جاگیردار اور وڈیرے نظریاتی اساس سے ہی پھر گئے۔ انہوں نے نئی چھوڑ دی کہ قائداعظم سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ مگر کوئی دلیل؟ کوئی ثبوت؟ دلیل بس اتنی کہ قائداعظم نے کہا تھا کہ پاکستان میں تمام مذاہب کے لوگ اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے۔ عقل کے اندھو! اسلامی ریاست نے کب اس سے انکار کیا ہے۔ قائداعظم کے نظریے کو کنفیوز کرنے والے مفاد پرست سرمایہ دار اور جاگیردار تھے۔ یہ دو صرف دو فیصد تھے۔ یہ دو فیصد اٹھانوے فیصد پر مسلط ہوگئے۔ قوم کے ہر مطالبے پر قوم ہی کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ مطالبہ

پورا بھی ہوا تو سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ دو قصدیوں نے وہ غضب ڈھایا کہ آج چھ دہائیاں گزرنے پر بھی یہ طے نہیں ہو سکا کہ قائداعظم کیا تھے۔ شیعہ تھے یا سنی۔ شیعہ تھے تو رافضی تھے یا اسماعیلی۔ سیکولر تھے یا مذہب پسند۔ اسلامی فلاحی ریاست بنانا چاہتے تھے یا سیکولر۔ جوابات ہیں مگر کلیئر کوئی ہونے نہیں دے رہا۔ مسلمان لٹ گئے۔ دھوکہ کھا گئے۔ اسلامی ریاست میں ہی اسلام ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے۔ راہنماؤں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ کہاں کے مسلمان، کیسا پاکستان ۔ اوپر سے آمر مسلط کر دیے گئے۔ سیاسی قوتوں کو دیوار سے لگا دیا گیا۔ جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ سولی چڑھا دیا گیا۔ کوڑے مارے گئے۔ ملک بدر کیے گئے۔ جس نے ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھی اسے پھانسی ہو گئی۔ جس نے ملک کو ایٹمی قوت بنایا وہ پابند سلاسل ہو گیا۔ جس نے ایٹمی دھماکے کیے وہ ملک بدر ہو گیا۔ جن جوانوں نے سرحدوں کی حفاظت کی انہی کو شتری میں رکھ کر امریکہ کے حوالے کر دیا گیا۔ عدالت کے فیصلوں سے آسمانی فیصلے نکل گئے۔ نصاب سے دین نکل گیا۔ پارلیمنٹ میں حدود آرڈیننس جیسے بل منظور ہو گئے۔ نظام عدل ریگولیشن چھین لیا گیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں سے "اسلامی" کو انگیز نے پر زور لگایا گیا۔ اسرائیل کو تسلیم کرنے کے لیے تال سے تال ملائے گئے۔ اغیار سے مراسم اور اپنوں پہ مظالم روا رکھے گئے۔ اپنی ہی قوم کو فتح کیا گیا۔ مساجد میں آپریشن کیے گئے۔ ملالہ اور عافیہ کی صورت میں دوہرا معیار دیا گیا۔ بے حیائی کی انڈسٹریاں لگا دی گئیں۔ جس نے حق مانگا وہ دیوار سے لگا دیا گیا۔ پولیس مقابلے میں مار دیا گیا۔ صرف مذہبی لٹریچر برآمد ہونے پر فوجیوں کے کورٹ مارشل ہو گئے۔ جو دہشت گرد تھے وہ سر کا تاج ہو گئے۔ جو مجاہدین تھے وہ دہشت گرد ہو گئے۔ فیملی سمیت لاپتہ کر دیے گئے۔ ماورائے عدالت مار دیے گئے۔ بیچ دیے گئے۔ میڈیا انڈسٹری میں اہل مذہب کے لیے انتہا پسند اور دقیانوس جیسے طعنے تیار ہوئے۔ نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کے لیے نت نئی امیدیں تراشی گئیں۔ ہمارا تمہارا کلچر ایک ہے کے راگ الاپے گئے۔ لا الہ کے سوا پاکستان کے کسی نئے مطلب پر غور کرنے کی ترغیب دی گئی۔ مگر کیوں؟ کیا جمہوریت میں عوامی فیصلوں کا صلہ یہی درج ہے؟

اب واپس مصر کی سرحدات پر چلیں۔ سامنے ہی دیکھیں بیت المقدس ہے۔ انبیا کی یہ

سرزمین ہے۔ اسلام کی ہزاروں برس کی یہ تاریخ ہے۔ اس کو فلسطین کہتے ہیں۔ فلسطین کی حالیہ جمہوری تاریخ بھی اٹھا کر دیکھ لیں۔ جمہوریت کی غیر جمہوری داستانیں یہاں بھی بکھری پڑی ہیں۔ یہاں پر آباد مسلمان چاروں اطراف سے گھیرے میں ہیں۔ گھیراؤ میں آئے ہوئے یہاں کے شہری بیرونی تسلط سے نکلنا چاہتے ہیں۔ ہر طرح کا نسخہ انہوں نے آزمالیا۔ نسخۂ جمہور بھی یہ آزما چکے۔ اسی نسخے کو بروئے کار لانے کے لئے حماس (حرکۃ المقاومۃ الاسلامیہ) قائم ہوئی۔ حماس فلسطین کی ایک مقامی تنظیم ہے۔ فلسطین کے تحریکی نوجوان اور اسلامسٹ اسی تنظیم پر اعتماد کرتے ہیں۔ اسرائیل کو وہ عالم عرب کے سینے میں پیوست ایک زہریلا خنجر سمجھتے ہیں۔ فلسطین کو ایک اسلامی ریاست کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ ان کا حق بھی ہے کہ فلسطین بھی ہے کہ یہ زمین ان کی ہے۔ حماس اپنے اس حق کے لیے اقتدار پر قابض ہونا نہیں چاہتی۔ وہ آئین اور جمہوریت کے بتائے ہوئے طریقہ کار کو اپنانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے حماس نے فلسطین کی عوام سے رابطہ کیا۔ فلسطین میں بسنے والے اسلامسٹوں نے حماس کو اہمیت دی۔ اس میں اب حماس کا کیا قصور؟ قصور عوام کا ہے۔ وہ عوام جسے اپنے نمائندے کے انتخاب کا اختیار جمہوریت نے دیا ہے۔ انہوں نے 2006 کے عام انتخابات میں حماس کو منتخب کرلیا۔ حماس بھاری اکثریت سے جیت کر ایوان میں آگئے۔ سر پر سوار اسرائیل حماس کی اس جیت کو برداشت کیسے کرسکتا تھا۔ حسب روایت اسرائیل نے اپنے فلسطینی لاڈلوں کو استعمال کرتے ہوئے حماس کی منتخب حکومت گرادی۔ مگر کیوں؟ وہ تو عوام کے لیے آئے تھے، عوام ہی میں سے تھے اور عوام نے ہی منتخب کیا تھا۔ اگر اسرائیل کے حواری منتخب ہو جاتے تو؟ کیا تب بھی یہی کچھ کیا جاتا؟ یہی صورت حال شام کی ہے۔ جدی پشتی آمریت چلی آرہی ہے۔ مغربی طاقتیں ہی ہمیشہ اس آمریت کی پشتبان رہیں۔ اسی طرح ایک نظر برما پر ڈال لیجیے۔ اراکان کے مسلمانوں کو تو برما کی حکومت اپنا شہری ماننے سے ہی انکاری ہے۔ ان کے گھر آگ میں جھونک دیے۔ ان کی زمینیں چھین لی گئیں۔ انسان زندہ جلا دیے گئے۔ لاشوں کے انبار لگا دیے گئے۔ وہ کہاں جائیں؟ پڑوسی ممالک انہیں پناہ دینے پر آمادہ نہیں۔ بنگلہ دیش جایئے تو وہاں بھی قیامت برپا ہے۔ مذہبی سیاست پر پابندی عائد کردی گئی ہے۔ مذہبی قیادت کو موت کی سزائیں سنادی گئی ہیں۔ جنہوں نے اس

جبر کے خلاف پرامن آواز بلند کی ان پر اسٹریٹ فائر چلا دیے۔ کھوپڑیاں کھول دیں۔ نماز جمعہ کے اجتماعات پر حملے ہوئے۔ ریاستی سرپرستی میں غنڈوں نے قتل عام کیا۔ جس طرف دیکھیں یہی المیہ۔ جہاں بھی جائیں یہی داستان۔

دنیا پوچھتی ہے کہ انتہا پسند کیسے پیدا ہوتے ہیں۔ انتہا پسند پیدا ہو جائیں تو انہی کو بدی کا محور قرار دے دیا جاتا ہے۔ ٹھیک کون ہے اور غلط کون، اس کا جواب کچھ سوالوں میں پنہاں ہے۔ ترکی میں ایک جماعت آئینی راستہ اختیار کرے۔ عوام اس جماعت کو اپنے لیے نجات دہندہ سمجھے۔ مگر وہ جماعت غلط راستے کا انتخاب نہ کرے۔ انتخابات کا انتظار کرے۔ انتخابات بھی فوج اور اس کی وظیفہ خوار جماعت کی نگرانی میں ہوں۔ اس کے باوجود عوام اپنا فیصلہ فوج اور اس کے حمایتیوں کے خلاف دیدے۔ مگر عوام کے اس فیصلے کو مسترد کر دیا جائے۔ حکومت گرا دی جائے۔ عالمی طاقتیں فوج کے ساتھ کھڑی ہو جائیں۔ تو بتائیں کہ وہ عوام کہاں جائیں؟ الجزائر میں ایک جماعت پرامن سیاسی جدوجہد کرے۔ عوام اس جماعت کو اپنے مسائل کا حل سمجھے۔ مگر جماعت غیر آئینی راستے کا انتخاب نہ کرے۔ انتخابات کا انتظار کرے۔ انتخابات الجزائر کی فوج اور اس کے حمایتیوں کی نگرانی میں ہوں۔ اس کے باوجود عوام فوج اور اس کے حواریوں کے خلاف فیصلہ سنا دیں۔ مگر ابھی انتخابات کا دوسرا مرحلہ باقی ہو اور فوج عوام کے فیصلے کو مسترد کر دے۔ انتخابی عمل روک کر عوام کی حمایت یافتہ جماعت پر پابندی عائد کر دے۔ تو آپ بتائیں الجزائر کے مسلمان کہاں جائیں؟ مصر میں ایک پرامن جماعت کا قیام عمل میں آئے۔ وہ عوام سے رابطہ کرے۔ عوام اس جماعت کو اپنے دکھوں کا مداوا سمجھ لے۔ پھر اسی برس تک اس جماعت کی مار مار درگت بنادی جائے۔ مگر وہ غلط راستے کا انتخاب نہ کرے۔ انتخابات کا انتظار کرے۔ انتخابات فوج اور اس کی قائم کردہ عدالت کی نگرانی میں ہوں۔ اس کے باوجود عوام فوج اور عدالت کے خلاف اپنا فیصلہ سنا دیں۔ مگر فوج عوام کے اس فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے حکومت کا دھڑن تختہ کر دے۔ تو آپ بتائیں مصر کے مسلمان کہاں جائیں۔ فلسطین میں ایک جماعت قائم ہو۔ وہ عوام سے رابطہ کرے۔ عوام اس جماعت کو اپنے درد کی دوا سمجھ لیں۔ مگر وہ جماعت کسی غلط راستے کا انتخاب نہ کرے۔ انتخابات کا انتظار کریں۔ انتخابات بھی اسرائیل کے

لاڈلوں کی نگرانی میں ہو رہے ہوں۔ اس کے باوجود عوام اسرائیل اور اس کے حواریوں کے خلاف فیصلہ سنا دیں۔ مگر اسرائیل کے حواری عوام کے اس فیصلے کو مسترد کر دیں۔ منتخب جماعت کا تختہ الٹ دیں۔ تو آپ بتائیں کہ فلسطین کے عوام کہاں جائیں۔ قائداعظم ہندوستان کے مسلمانوں کو دو قومی نظریہ دیں۔ اسلامی فلاحی ریاست کا خواب دیں۔ لا الہ الا اللہ کا نعرہ دیں۔ قرآن و سنت کے وعدے دیں۔ عوام قائداعظم کو اپنے درد کی دوا سمجھ لیں۔ وہ ان کی آواز پر لبیک کہیں۔ وہ خاندان قربان کر دیں ۔ کاروبار برباد کر دیں ۔ جانوں پر کھیل جائیں۔ پاکستان پہنچ جائیں۔ پاکستان پہنچ کر قائداعظم کے آجو باجو کھڑے راہنما ہی نعرے سے مکر جائیں۔ وعدے فراموش کر دیے جائیں۔ دعوے بھلا دیے جائیں۔ عوام دعوے اور وعدے یاد دلائیں تو انہیں سلاخوں کے پیچھے پھینک دیا جائے۔ بیچ دیا جائے۔ لاپتہ کر دیا جائے۔ تو آپ بتلائیں کہ پاکستان کے مسلمان کہاں جائیں۔ شام کے مسلمان کہاں جائیں ؟ اراکان کے مسلمان کہاں جائیں۔ بنگلہ دیش کے مسلمان کہاں جائیں۔

پاکستان سے لے کر ترکی تک، ترکی سے الجزائر تک اور وہاں سے لے کر مصر تک، جب منتخب حکومتیں الٹ کر ان لوگوں کو مسلط کر دیا جائے جو اسی انتخابات میں مسترد کیے جا چکے ہوں۔ پھر امریکہ سے لے کر اسرائیل تک اور اقوام متحدہ سے لے کر او آئی سی تک، بھی ''جمہوریت'' کی علمبردار قومیں ان مسترد لوگوں کی پشت پر کھڑی ہو چکی ہوں، تو پھر ذرا بتلائیں تاکہ یہ محروم لوگ کہاں جائیں۔ کہیں تو جائیں گے۔ آخری راستہ ان کے پاس ایک ہی ہو سکتا ہے۔ ایک راستہ۔ ''انتقام''۔ اس انتقام کا نام پھر القاعدہ بن جاتا ہے۔ طالبان بن جاتا ہے۔ انتقام کے اسی دہانے پر مصر کے مسلمان کو کھڑا کر کے دنیا پوچھتی ہے انتہا پسند کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ انتہا پسند ایسے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر عمل کا ایک ردعمل بھی ہوتا ہے۔ ہر ''کیسے'' کا ایک ''ایسے'' بھی ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner